بسم الله الرحمن الرحيم

پارہ نمبر 1

سورة البقرة

آیت نمبر 36 - 21

اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ﴿٢١﴾

مولانا عبدالحمید سواتیؒ (معالم العرفان میں) فرماتے ہیں کہ:

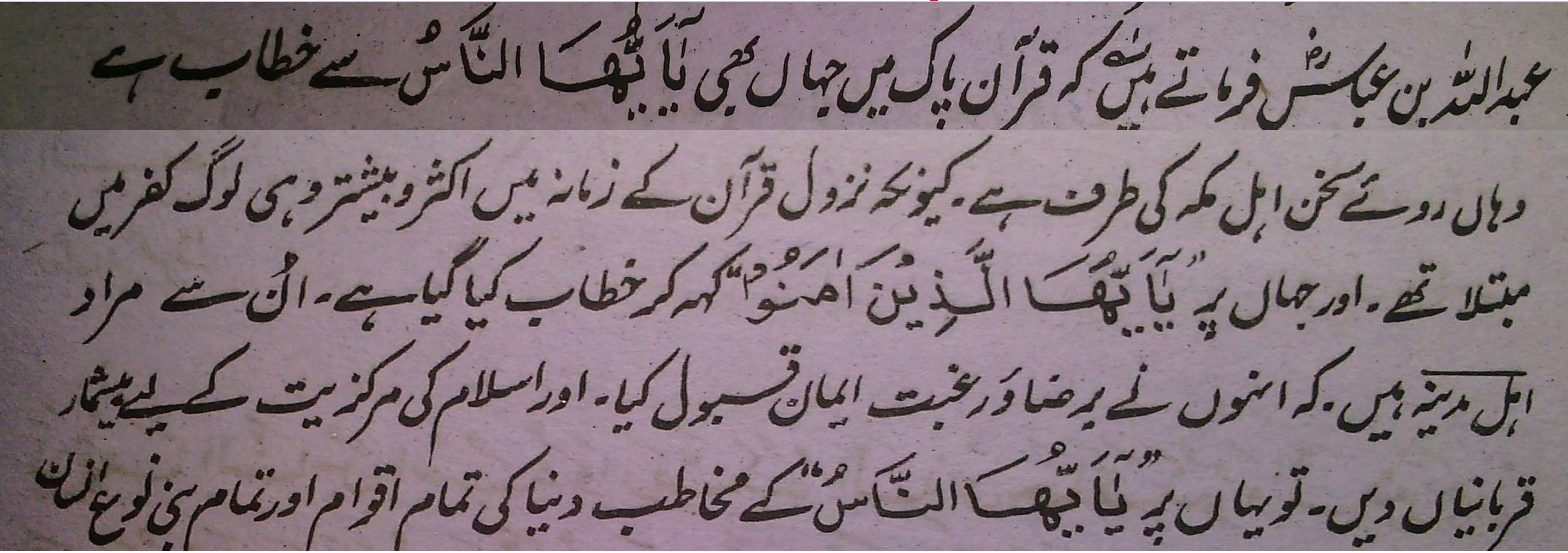

عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جہاں بھی یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ سے خطاب ہے وہاں روئے سخن اہل مکہ کی طرف ہے۔ کیونکہ نزول قرآن کے زمانہ میں اکثر و بیشتر وہی لوگ کفر میں مبتلا تھے۔ اور جہاں پر "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ اُن سے مراد اہل مدینہ ہیں۔ کہ انہوں نے برضا و رغبت ایمان قبول کیا۔ اور اسلام کی مرکزیت کے لیے بیشمار قربانیاں دیں۔ تو یہاں پر "یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ" کے مخاطب دنیا کی تمام اقوام اور تمام بنی نوع انسان

جاری ہے

مولانا عبدالحمید سواتیؒ (معالم العرفان میں) فرماتے ہیں کہ:

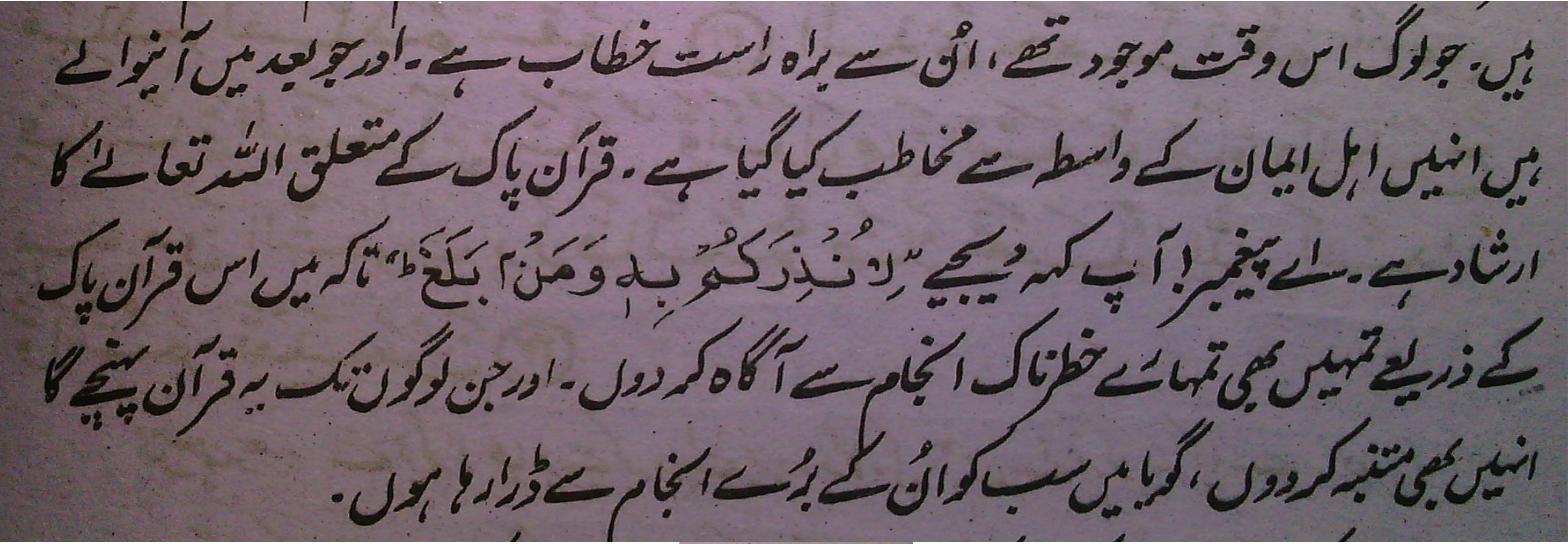

ہیں۔ جو لوگ اس وقت موجود تھے، ان سے براہِ راست خطاب ہے۔ اور جو بعد میں آنے والے ہیں انہیں اہل ایمان کے واسطے سے مخاطب کیا گیا ہے۔ قرآن پاک کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "اے پیغمبر! آپ کہہ دیجیے" لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْۢ بَلَغَؕ تاکہ میں اس قرآن پاک کے ذریعے تمہیں بھی تمہارے خطرناک انجام سے آگاہ کر دوں۔ اور جن لوگوں تک یہ قرآن پہنچے گا انہیں بھی متنبہ کر دوں، گویا میں سب کو ان کے برے انجام سے ڈرا رہا ہوں۔

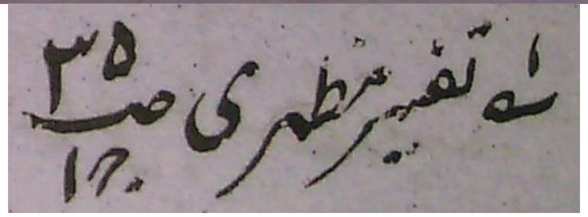

لہ تفسیر مظہری ص ۳۵ / ۱۷

مولانا عبدالحمید سواتیؒ (معالم العرفان میں) فرماتے ہیں کہ:

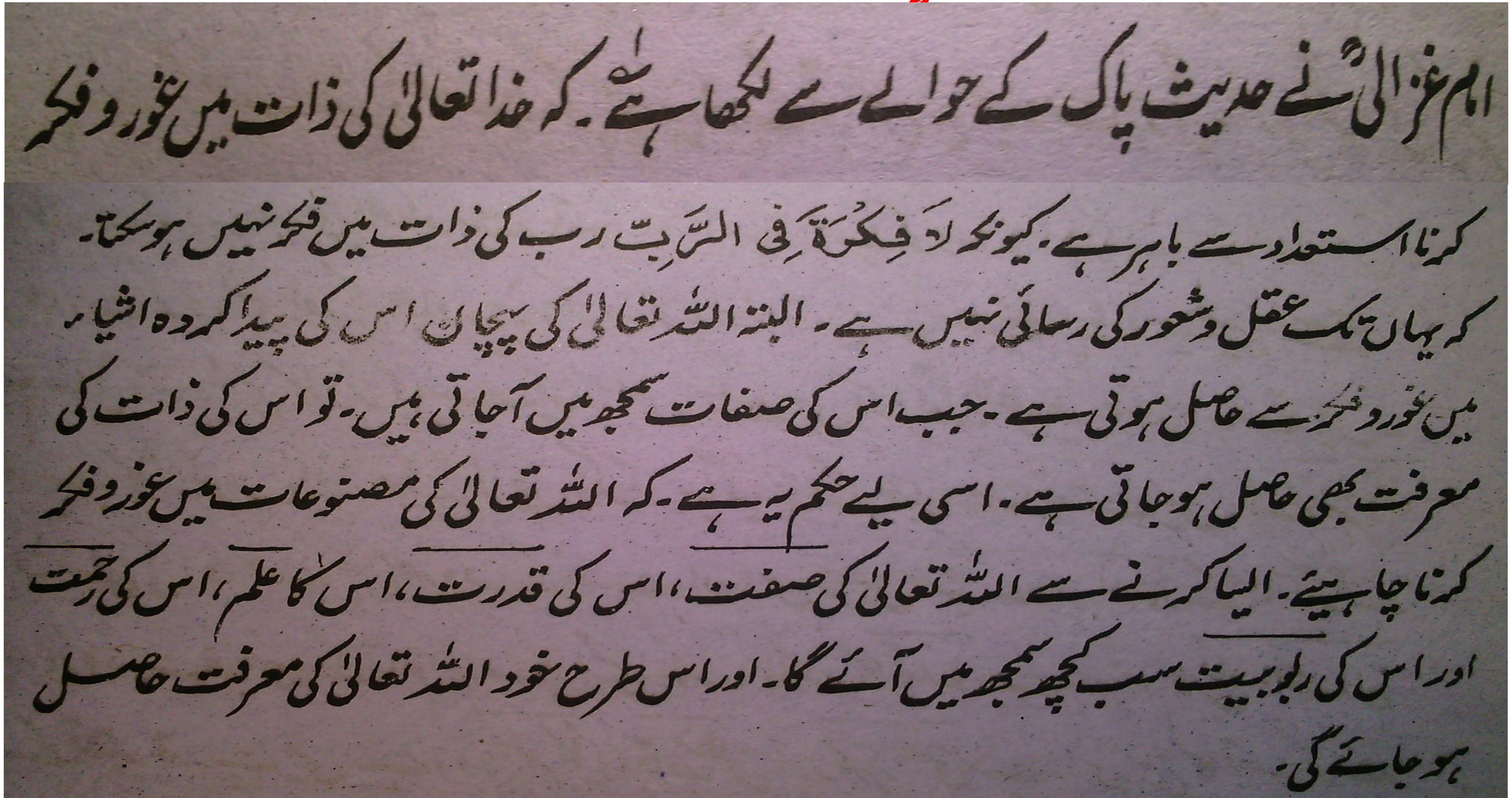

امام غزالیؒ نے حدیث پاک کے حوالے سے لکھا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر کرنا استعداد سے باہر ہے۔ کیونکہ لَا فِکْرَۃَ فِی الرَّبِّ رب کی ذات میں فکر نہیں ہو سکتا۔ کہ یہاں تک عقل و شعور کی رسائی نہیں ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی پہچان اس کی پیدا کردہ اشیاء میں غور و فکر سے حاصل ہوتی ہے۔ جب اس کی صفات سمجھ میں آجاتی ہیں۔ تو اس کی ذات کی معرفت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے حکم یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی مصنوعات میں غور و فکر کرنا چاہیئے۔ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی صفت، اس کی قدرت، اس کا علم، اس کی رحمت اور اس کی ربوبیت سب کچھ سمجھ میں آئے گا۔ اور اس طرح خود اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے گی۔

مولانا عبدالحمید سواتیؒ (معالم العرفان میں) فرماتے ہیں کہ:

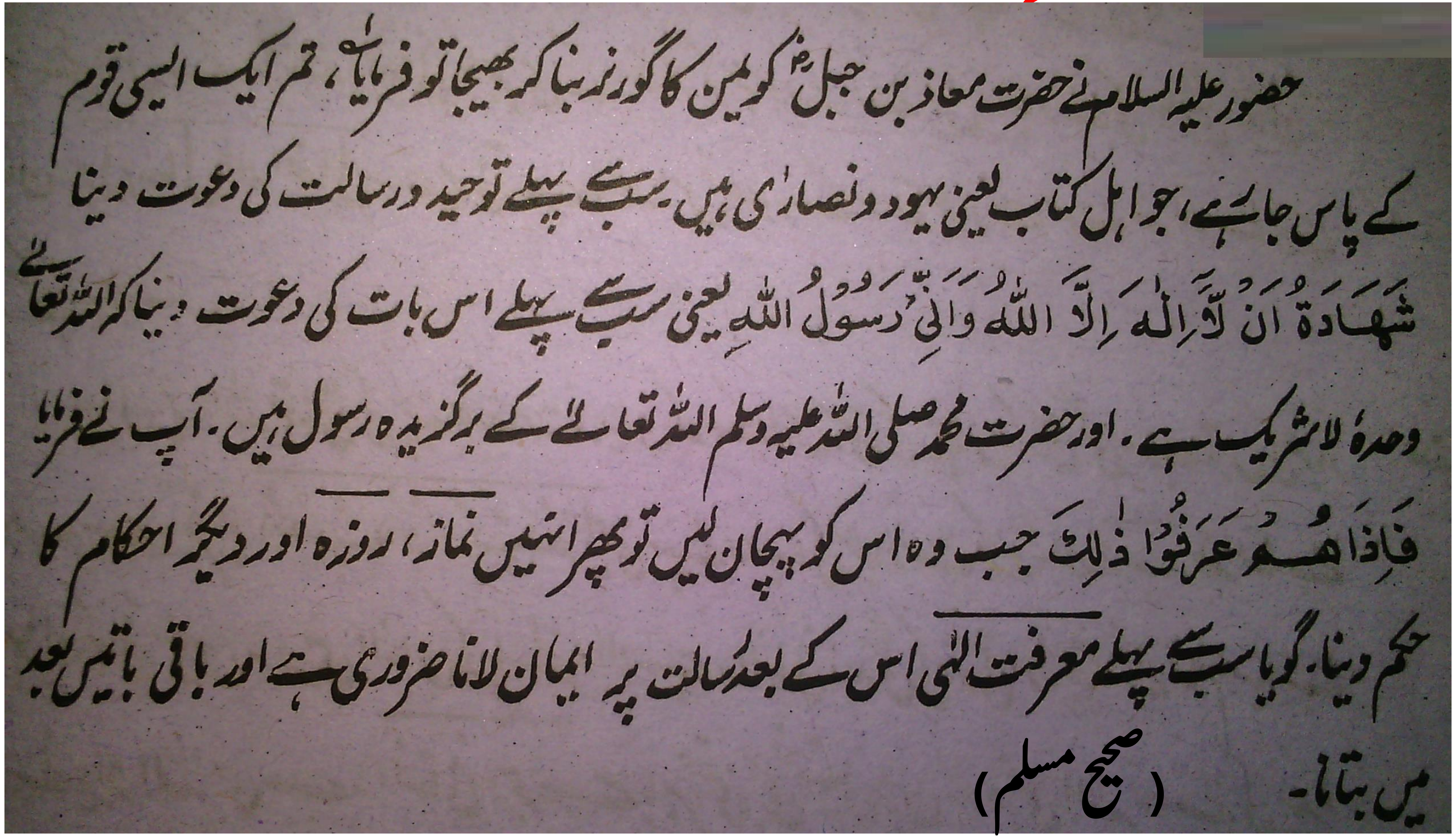

حضور علیہ السلام نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو فرمایا، تم ایک ایسی قوم کے پاس جا رہے ہو، جو اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہیں۔ سب سے پہلے توحید و رسالت کی دعوت دینا شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ یعنی سب سے پہلے اس بات کی دعوت دینا کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول ہیں۔ آپ نے فرمایا فَاِذَا هُمْ عَرَفُوْا ذٰلِكَ جب وہ اس کو پہچان لیں تو پھر انہیں نماز، روزہ اور دیگر احکام کا حکم دینا۔ گویا سب سے پہلے معرفت الٰہی اس کے بعد رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے اور باقی باتیں بعد میں بتانا۔

(صحیح مسلم)

مولانا عبدالحمید سواتی ؒ (معالم العرفان میں) فرماتے ہیں کہ:

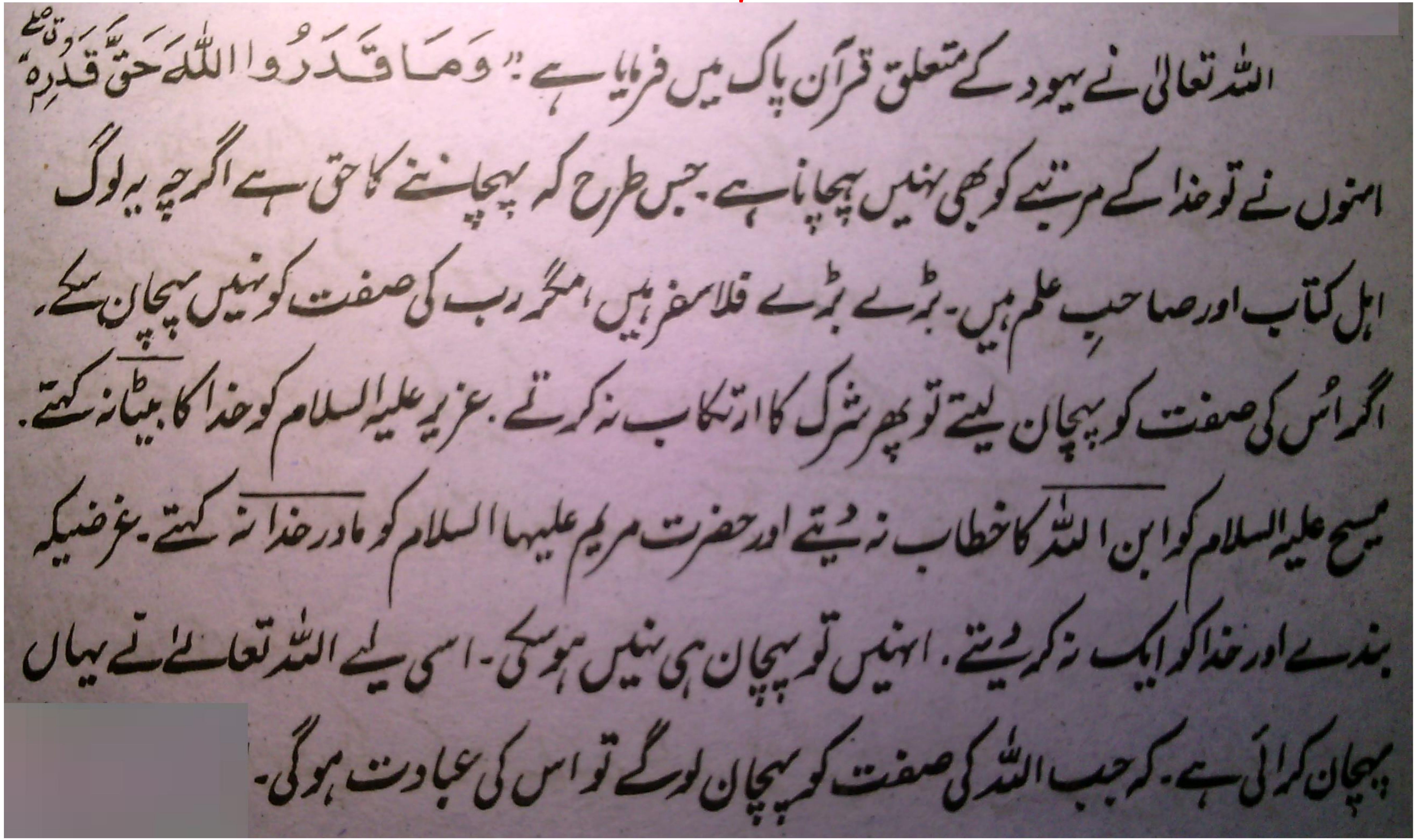

اللہ تعالیٰ نے یہود کے متعلق قرآن پاک میں فرمایا ہے۔ "وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ" انہوں نے تو خدا کے مرتبے کو بھی نہیں پہچانا ہے۔ جس طرح کہ پہچاننے کا حق ہے اگرچہ یہ لوگ اہل کتاب اور صاحب علم ہیں۔ بڑے بڑے فلاسفر ہیں، مگر رب کی صفت کو نہیں پہچان سکے۔ اگر اُس کی صفت کو پہچان لیتے تو پھر شرک کا ارتکاب نہ کرتے۔ عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا نہ کہتے۔ مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کا خطاب نہ دیتے اور حضرت مریم علیہا السلام کو مادر خدا نہ کہتے۔ غرضیکہ بندے اور خدا کو ایک نہ کر دیتے۔ انہیں تو پہچان ہی نہیں ہو سکی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں پہچان کرائی ہے۔ کہ جب اللہ کی صفت کو پہچان لو گے تو اس کی عبادت ہو گی۔

مولانا عبدالحمید سواتیؒ (معالم العرفان میں) فرماتے ہیں کہ:

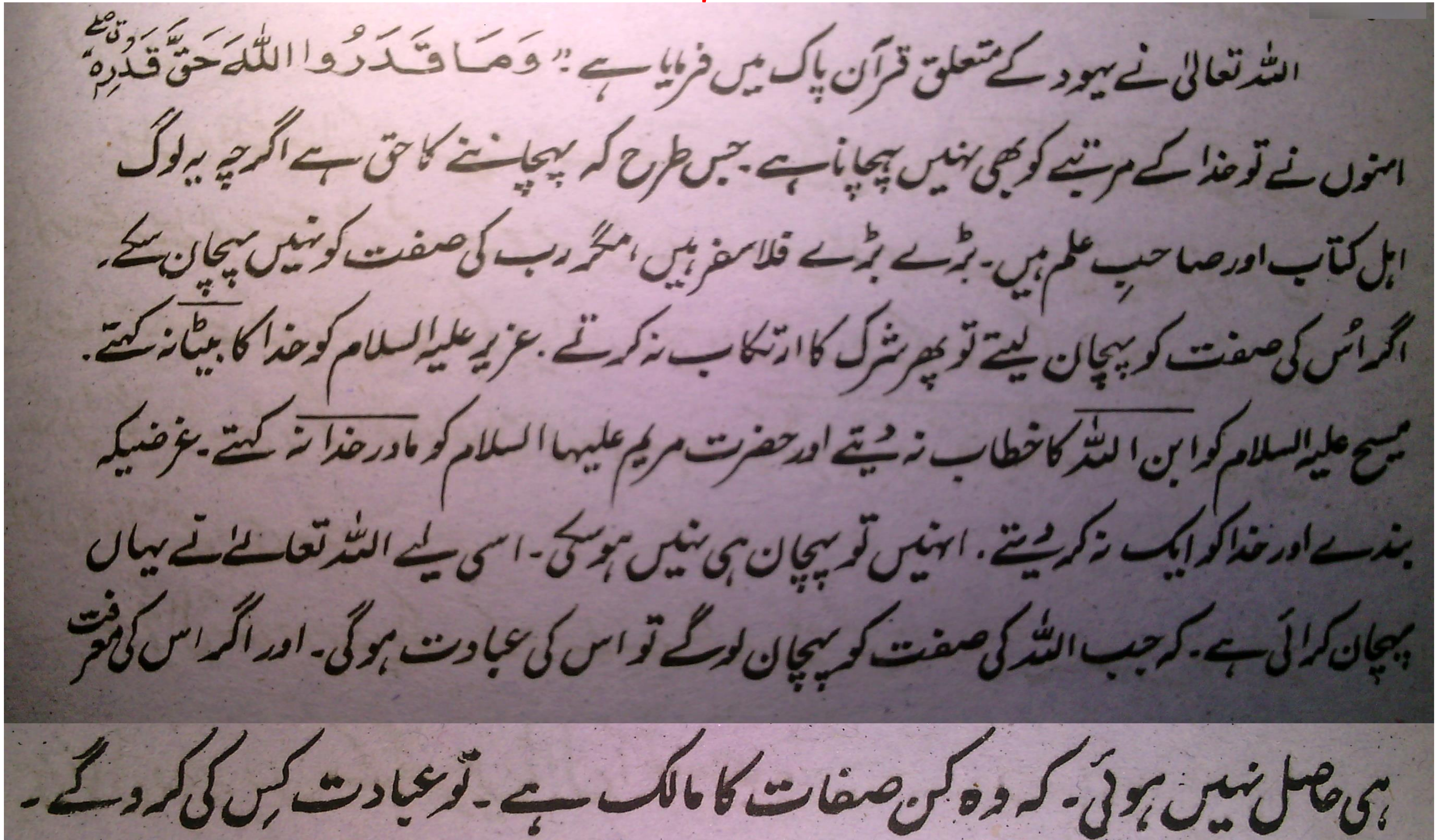

اللہ تعالیٰ نے یہود کے متعلق قرآن پاک میں فرمایا ہے:" وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ " انہوں نے تو خدا کے مرتبے کو بھی نہیں پہچانا ہے۔ جس طرح کہ پہچاننے کا حق ہے اگرچہ یہ لوگ اہل کتاب اور صاحب علم ہیں۔ بڑے بڑے فلاسفر ہیں، مگر رب کی صفت کو نہیں پہچان سکے۔ اگر اُس کی صفت کو پہچان لیتے تو پھر شرک کا ارتکاب نہ کرتے۔ عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا نہ کہتے۔ مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کا خطاب نہ دیتے اور حضرت مریم علیہا السلام کو مادر خدا نہ کہتے۔ غرضیکہ بندے اور خدا کو ایک نہ کر دیتے۔ انہیں تو پہچان ہی نہیں ہو سکی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں پہچان کرائی ہے۔ کہ جب اللہ کی صفت کو پہچان لو گے تو اس کی عبادت ہو گی۔ اور اگر اس کی معرفت ہی حاصل نہیں ہوئی۔ کہ وہ کس صفات کا مالک ہے۔ تو عبادت کس کی کرو گے۔

مولانا ادریس کاندھلویؒ (معارف القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

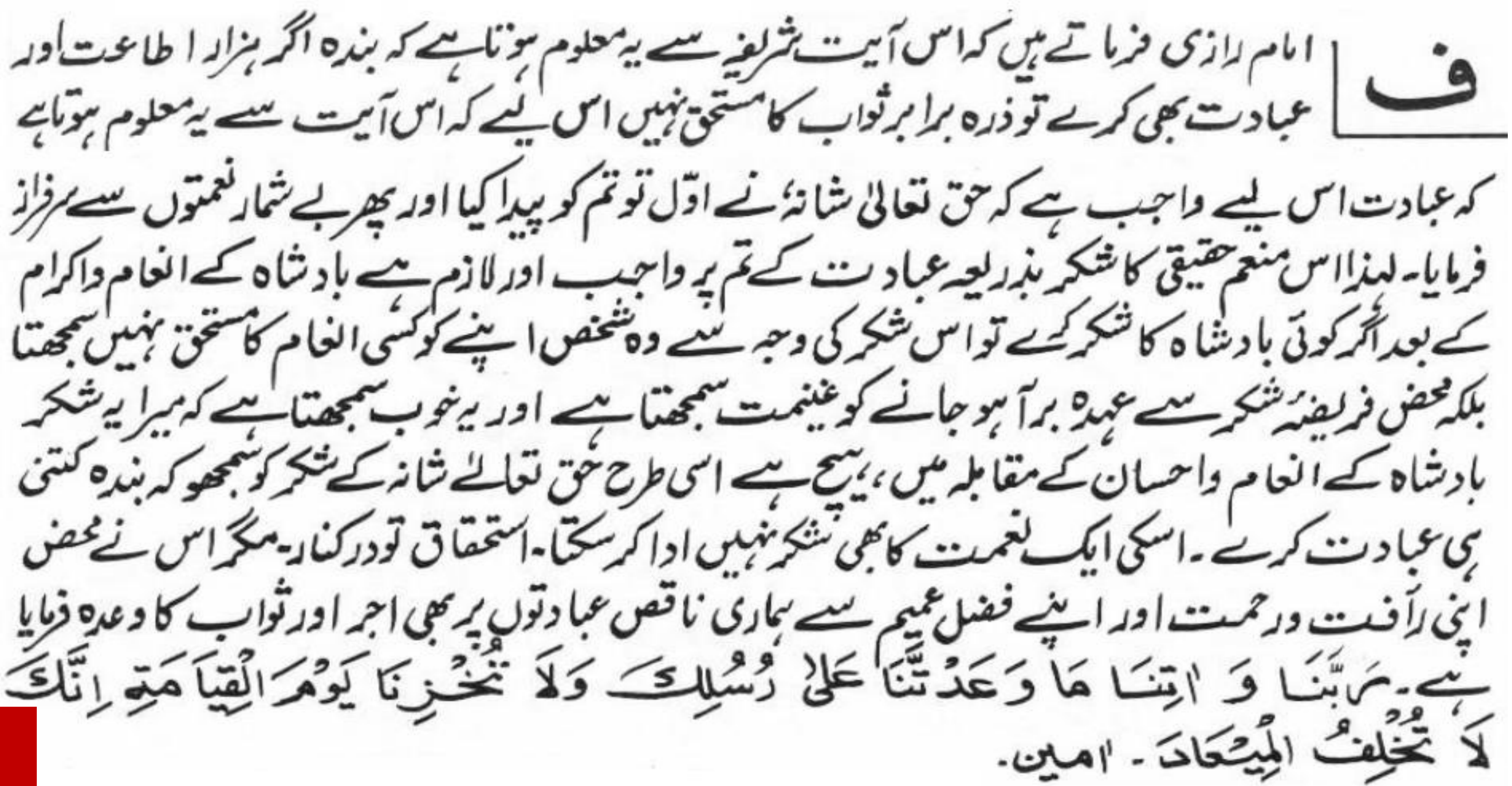

ف امام رازی فرماتے ہیں کہ اس آیت شریفہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندہ اگر ہزار اطاعت اور عبادت بھی کرے تو ذرہ برابر ثواب کا مستحق نہیں اس لیے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبادت اس لیے واجب ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اوّل تو تم کو پیدا کیا اور پھر بے شمار نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ لہٰذا اس منعم حقیقی کا شکر بذریعہ عبادت کے تم پر واجب اور لازم ہے بادشاہ کے انعام واکرام کے بعد اگر کوئی بادشاہ کا شکر کرے تو اس شکر کی وجہ سے وہ شخص اپنے کو کسی انعام کا مستحق نہیں سمجھتا بلکہ محض فریضۂ شکر سے عہدہ برآ ہو جانے کو غنیمت سمجھتا ہے اور یہ خوب سمجھتا ہے کہ میرا یہ شکر بادشاہ کے انعام واحسان کے مقابلہ میں ہیچ ہے اسی طرح حق تعالےٰ شانہ کے شکر کو سمجھو کہ بندہ کتنی ہی عبادت کرے۔ اسکی ایک نعمت کا بھی شکر نہیں ادا کر سکتا۔ استحقاق تو درکنار۔ مگر اس نے محض اپنی رأفت ورحمت اور اپنے فضل عمیم سے ہماری ناقص عبادتوں پر بھی اجر اور ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۔ اٰمین۔

جاری ہے

مولانا ادریس کاندھلویؒ (معارف القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

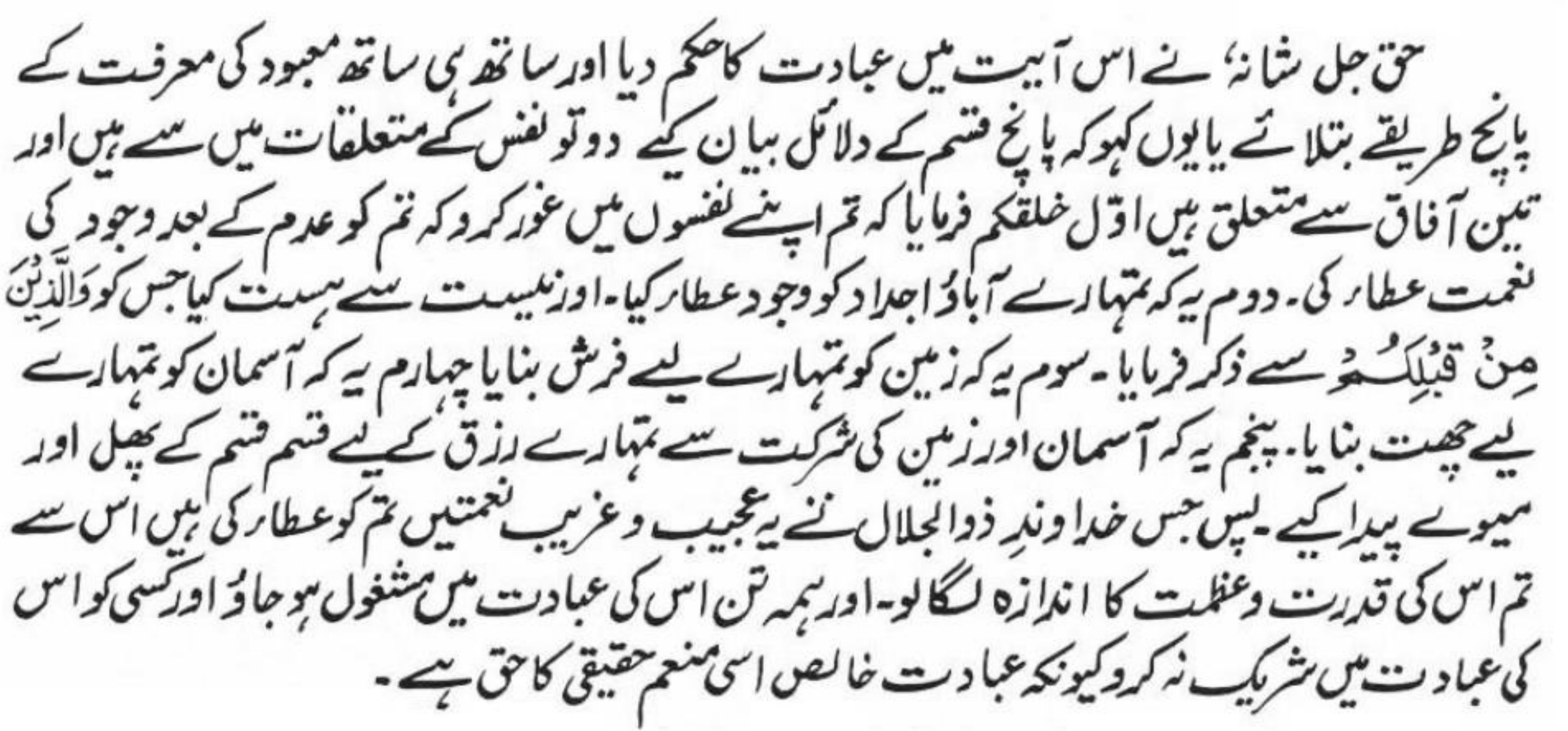

حق جل شانہٗ نے اس آیت میں عبادت کا حکم دیا اور ساتھ ہی ساتھ معبود کی معرفت کے پانچ طریقے بتلائے یا یوں کہو کہ پانچ قسم کے دلائل بیان کیے دو تو نفس کے متعلقات میں سے ہیں اور تین آفاق سے متعلق ہیں اول خلقکم فرمایا کہ تم اپنے نفسوں میں غور کرو کہ تم کو عدم کے بعد وجود کی نعمت عطار کی۔ دوم یہ کہ تمہارے آباؤ اجداد کو وجود عطار کیا۔ اور نیست سے ہست کیا جس کو وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ سے ذکر فرمایا۔ سوم یہ کہ زمین کو تمہارے لیے فرش بنایا چہارم یہ کہ آسمان کو تمہارے لیے چھت بنایا۔ پنجم یہ کہ آسمان اور زمین کی شرکت سے تمہارے رزق کے لیے قسم قسم کے پھل اور میوے پیدا کیے۔ پس جس خداوندِ ذوالجلال نے یہ عجیب و غریب نعمتیں تم کو عطار کی ہیں اس سے تم اس کی قدرت و عظمت کا اندازہ لگا لو۔ اور ہمہ تن اس کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ اور کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کرو کیونکہ عبادت خالص اسی منعم حقیقی کا حق ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ (بیان القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

عام طور پر لوگ جو غلط راستہ اختیار کر لیتے ہیں اُس پر اِس دلیل سے جمے رہتے ہیں کہ ہمارے آباء واَجداد کا راستہ یہی تھا۔ ﴿الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ﴾ کے الفاظ میں اس دلیل کا ردّ بھی موجود ہے کہ جیسے تم مخلوق ہو ویسے ہی تمہارے آباء واجداد بھی مخلوق تھے‘ جیسے تم خطا کر سکتے ہو اسی طرح وہ بھی تو خطا کر سکتے تھے۔ لہٰذا یہ نہ دیکھو کہ آباء واجداد کا راستہ کیا تھا‘ بلکہ یہ دیکھو کہ حق کیا ہے۔

﴿لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ”تاکہ تم بچ سکو“۔ یعنی دنیا میں افراط وتفریط کے دھکوں سے بچ سکو اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچ سکو۔ ان دونوں سے اگر بچنا ہے تو اللہ کی بندگی کی روش اختیار کرو۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ (تدبُّر قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

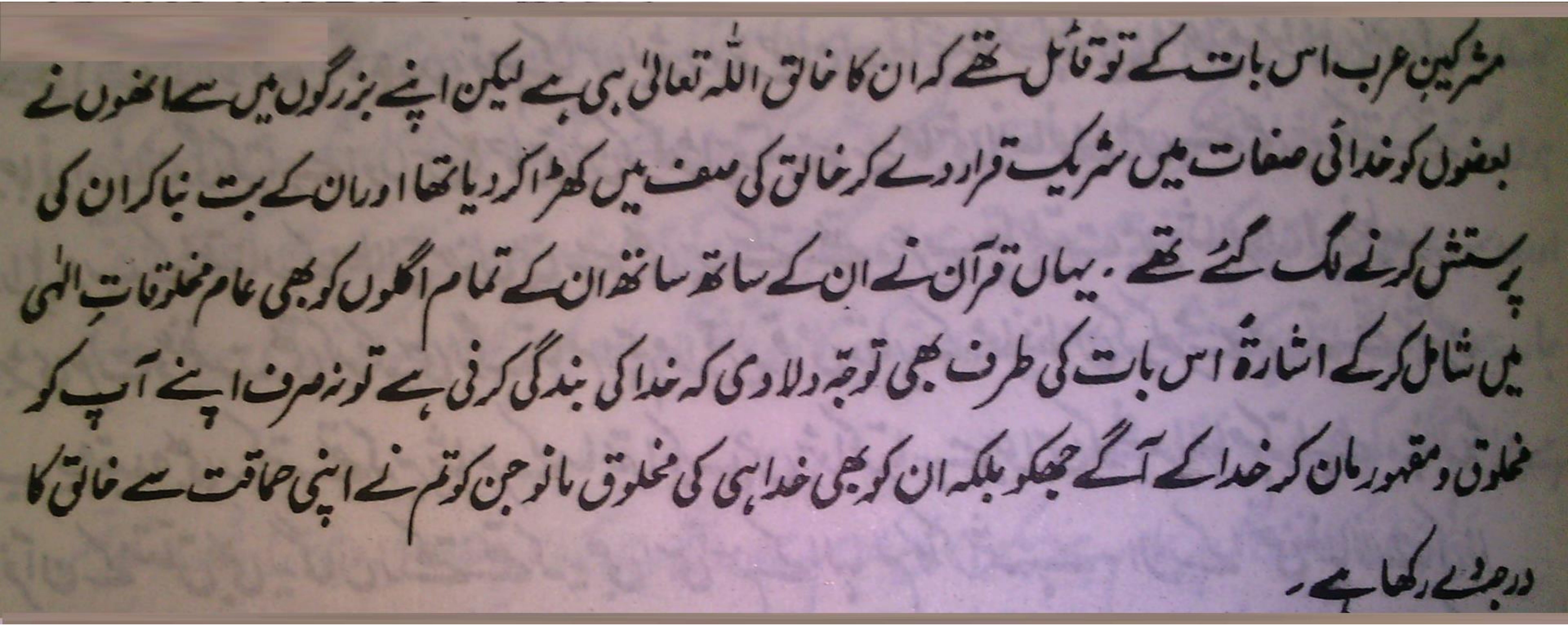

مشرکین عرب اس بات کے تو قائل تھے کہ ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن اپنے بزرگوں میں سے انھوں نے بعضوں کو خدائی صفات میں شریک قرار دے کر خالق کی صف میں کھڑا کر دیا تھا اور ان کے بت بنا کر ان کی پرستش کرنے لگ گئے تھے۔ یہاں قرآن نے ان کے ساتھ ساتھ ان کے تمام اگلوں کو بھی عام مخلوقاتِ الٰہی میں شامل کر کے اشارۃً اس بات کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ خدا کی بندگی کرنی ہے تو نہ صرف اپنے آپ کو مخلوق و مقہور مان کر خدا کے آگے جھکو بلکہ ان کو بھی خدا ہی کی مخلوق مانو جن کو تم نے اپنی حماقت سے خالق کا درجہ دے رکھا ہے۔

اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں

الَّذِىۡ جَعَلَ لَكُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّكُمۡۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّ
اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (تفسیر عثمانی میں) فرماتے ہیں کہ:

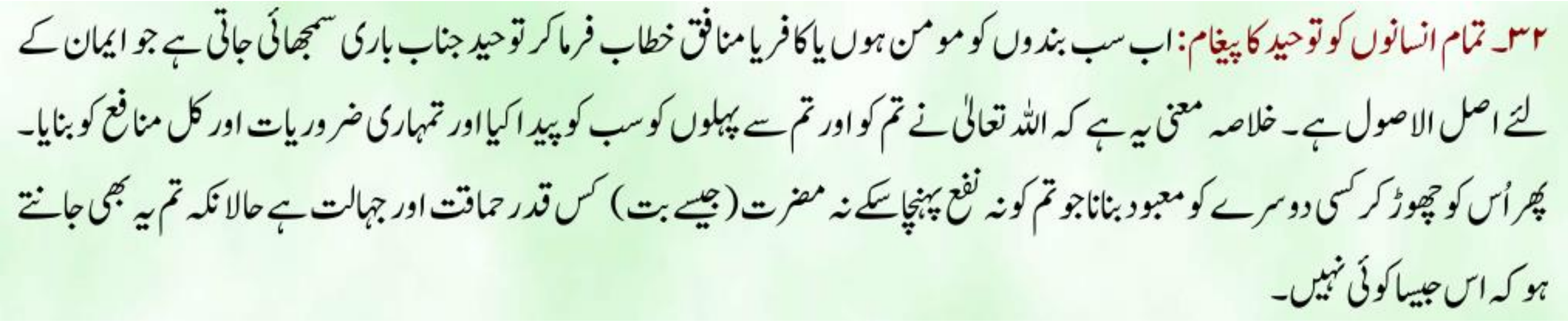

۳۲۔ تمام انسانوں کو توحید کا پیغام: اب سب بندوں کو مومن ہوں یا کافر یا منافق خطاب فرما کر توحید جناب باری سمجھائی جاتی ہے جو ایمان کے لئے اصل الاصول ہے۔ خلاصہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اور تم سے پہلوں کو سب کو پیدا کیا اور تمہاری ضروریات اور کل منافع کو بنایا۔ پھر اُس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو معبود بنانا جو تم کو نہ نفع پہنچا سکے نہ مضرت (جیسے بت) کس قدر حماقت اور جہالت ہے حالانکہ تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس جیسا کوئی نہیں۔

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

(۱۸) ان دو آیتوں میں اسلام کے بنیادی عقیدے توحید کی دعوت دی گئی ہے، اور مختصر انداز میں اس کی دلیل بھی بیان کر دی گئی ہے، اہلِ عرب یہ مانتے تھے کہ ساری کائنات کو پیدا کرنا، زمین و آسمان کی تخلیق اور آسمان سے بارش برسانا، اور اس سے پیداوار اُگانا، یہ سب کام اللہ تعالیٰ کے ہیں، اس کے باوجود وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے کام بتوں کے سپرد کر رکھے ہیں، اور وہ بت اپنے اپنے کاموں میں براہِ راست فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، لہٰذا وہ ان بتوں کی عبادت اس لئے کرتے تھے کہ وہ ان کی مدد کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ہر چیز پیدا کرنے والے ہم ہیں، اور ہمیں کائنات چلانے کے لئے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں، تو عبادت کسی اور کی کرنا کتنے بڑے ظلم کی بات ہے۔

اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۖ

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

مولانا ادریس کاندھلویؒ (معارف القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

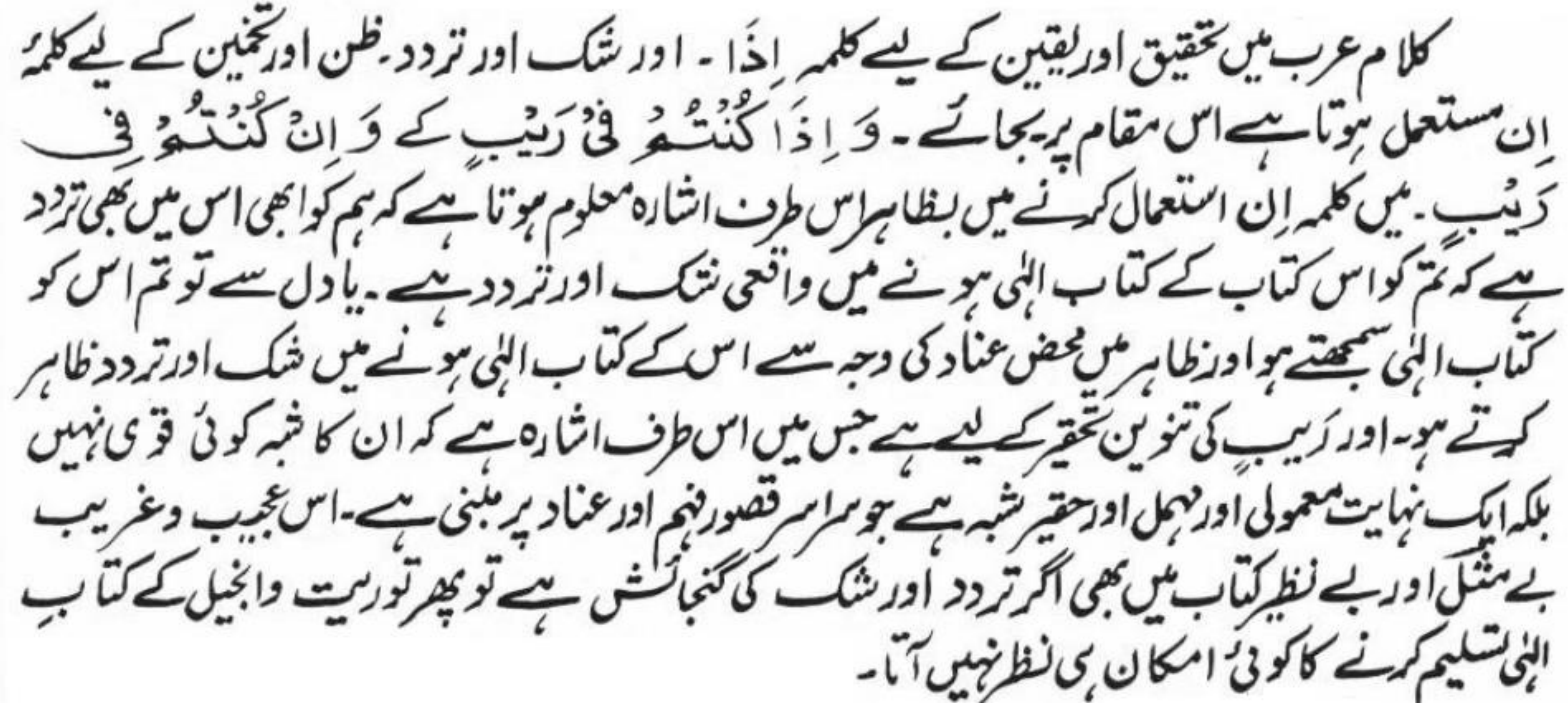

کلام عرب میں تحقیق اور یقین کے لیے کلمہ اِذَا - اور شک اور تردد۔ ظن اور تخمین کے لیے کلمہ اِن مستعمل ہوتا ہے اس مقام پر۔ بجائے - وَ اِذَا کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ کے وَ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ۔ میں کلمہ اِنْ استعمال کرنے میں بظاہر اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو ابھی اس میں بھی تردد ہے کہ تم کو اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں واقعی شک اور تردد ہے۔ یا دل سے تو تم اس کو کتاب الٰہی سمجھتے ہو اور ظاہر میں محض عناد کی وجہ سے اس کے کتاب الٰہی ہونے میں شک اور تردد ظاہر کرتے ہو۔ اور رَیبٍ کی تنوین تحقیر کے لیے ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا شبہ کوئی قوی نہیں بلکہ ایک نہایت معمولی اور مہمل اور حقیر شبہ ہے جو سراسر قصور فہم اور عناد پر مبنی ہے۔ اس عجیب و غریب بے مثل اور بے نظیر کتاب میں بھی اگر تردد اور شک کی گنجائش ہے تو پھر توریت و انجیل کے کتابِ الٰہی تسلیم کرنے کا کوئی امکان ہی نظر نہیں آتا۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (تفسیر عثمانی میں) فرماتے ہیں کہ:

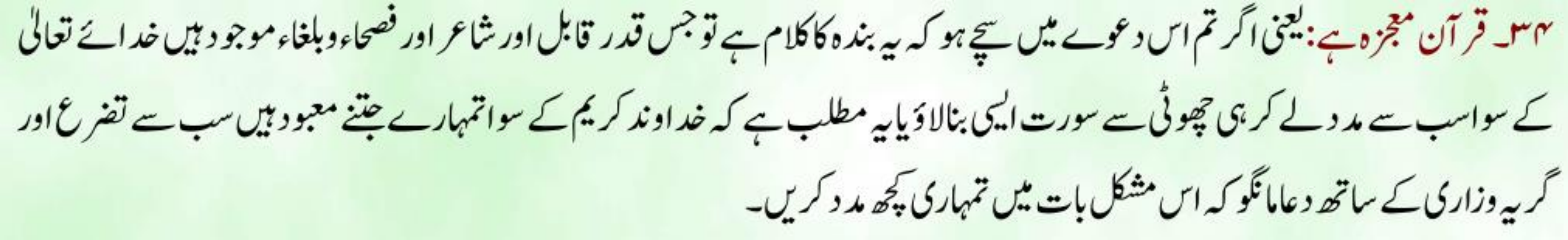

۳۴۔ قرآن معجزہ ہے: یعنی اگر تم اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ بندہ کا کلام ہے تو جس قدر قابل اور شاعر اور فصحاء وبلغاء موجود ہیں خدائے تعالیٰ کے سوا سب سے مدد لے کر ہی چھوٹی سے سورت ایسی بنالاؤ یا یہ مطلب ہے کہ خداوند کریم کے سوا تمہارے جتنے معبود ہیں سب سے تضرع اور گریہ وزاری کے ساتھ دعا مانگو کہ اس مشکل بات میں تمہاری کچھ مدد کریں۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ (بیان القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

﴿وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۲۳﴾ ”اور بلا لو اپنے سارے مددگاروں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔“

قریش کا خیال یہ تھا کہ شعراء کے پاس جن ہوتے ہیں‘ جو انہیں شعر سکھاتے ہیں‘ ورنہ عام آدمی تو شعر نہیں کہہ سکتا۔ چنانچہ فرمایا کہ جو بھی تمہارے مددگار ہوں‘ ایک اللہ کو چھوڑ کر جس کی بھی تم مدد حاصل کر سکتے ہو‘ جنات ہوں یا انسان ہوں‘ خطیب ہوں‘ شعراء ہوں یا ادیب ہوں‘ ان سب کو جمع کر لو اور اس قرآن جیسی ایک ہی سورت بنا کر لے آؤ‘ اگر تم سچے ہو۔

قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنے اندر جھانکنے کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ یہاں گویا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہا جا رہا ہے کہ حقیقت میں تمہیں اس قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے‘ یہ تو تم محض بات بنا رہے ہو۔ اگر تمہیں واقعتاً شک ہے‘ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو آؤ میدان میں اور اس جیسی ایک ہی سورت بنا لاؤ!

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ (تیسیر القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

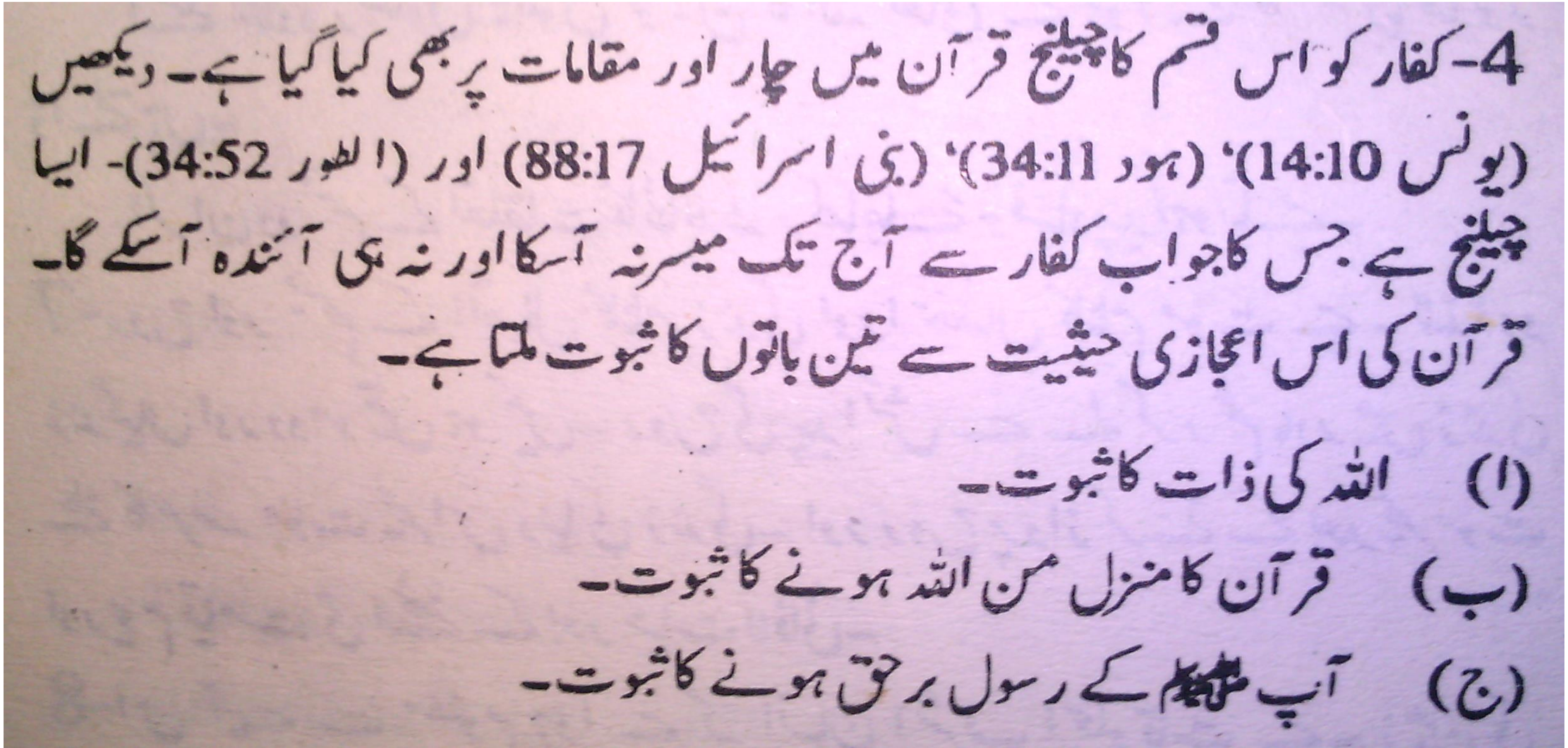

4- کفار کو اس قسم کا چیلنج قرآن میں چار اور مقامات پر بھی کیا گیا ہے۔ دیکھیں (یونس 14:10)، (ہود 34:11)، (بنی اسرائیل 88:17) اور (الطور 34:52)۔ ایسا چیلنج ہے جس کا جواب کفار سے آج تک میسر نہ آسکا اور نہ ہی آئندہ آسکے گا۔

قرآن کی اس اعجازی حیثیت سے تین باتوں کا ثبوت ملتا ہے۔

(ا) اللہ کی ذات کا ثبوت۔

(ب) قرآن کا منزل من اللہ ہونے کا ثبوت۔

(ج) آپ ﷺ کے رسول برحق ہونے کا ثبوت۔

مولانا امین احسن اصلاحی ؒ (تدبُّرِ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

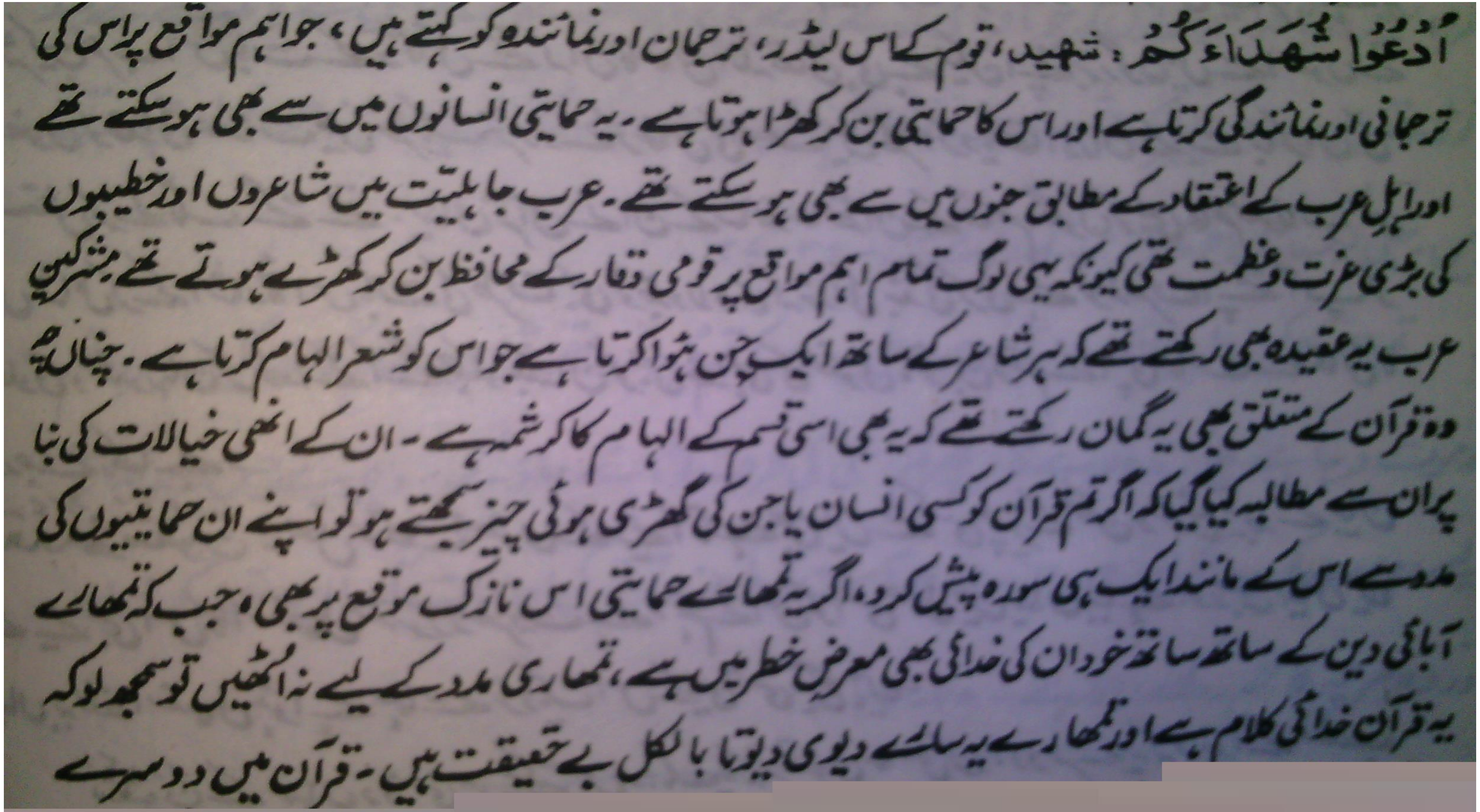

اُدْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ : شہید، قوم کے اس لیڈر، ترجمان اور نمائندہ کو کہتے ہیں، جو اہم مواقع پر اس کی ترجمانی اور نمائندگی کرتا ہے اور اس کا حمایتی بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ یہ حمایتی انسانوں میں سے بھی ہو سکتے تھے اور اہلِ عرب کے اعتقاد کے مطابق جنوں میں سے بھی ہو سکتے تھے۔ عرب جاہلیت میں شاعروں اور خطیبوں کی بڑی عزت و عظمت تھی کیونکہ یہی لوگ تمام اہم مواقع پر قومی وقار کے محافظ بن کر کھڑے ہوتے تھے۔ مشرکین عرب یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک جن ہوا کرتا ہے جو اس کو شعر الہام کرتا ہے۔ چنانچہ وہ قرآن کے متعلق بھی یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ بھی اسی قسم کے الہام کا کرشمہ ہے۔ ان کے انھی خیالات کی بنا پر ان سے مطالبہ کیا گیا کہ اگر تم قرآن کو کسی انسان یا جن کی گھڑی ہوئی چیز سمجھتے ہو تو اپنے ان حمایتیوں کی مدد سے اس کے مانند ایک ہی سورہ پیش کرو۔ اگر یہ تمھارے حمایتی اس نازک موقع پر بھی، جب کہ تمھارے آبائی دین کے ساتھ ساتھ خود ان کی خدائی بھی معرضِ خطر میں ہے، تمھاری مدد کے لیے نہ اٹھیں تو سمجھ لو کہ یہ قرآن خدائی کلام ہے اور تمھارے یہ سارے دیوی دیوتا بالکل بے حقیقت ہیں۔ قرآن میں دوسرے

اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ

وَالۡحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۴﴾

مولانا امین احسن اصلاحیؒ (تدبّر قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

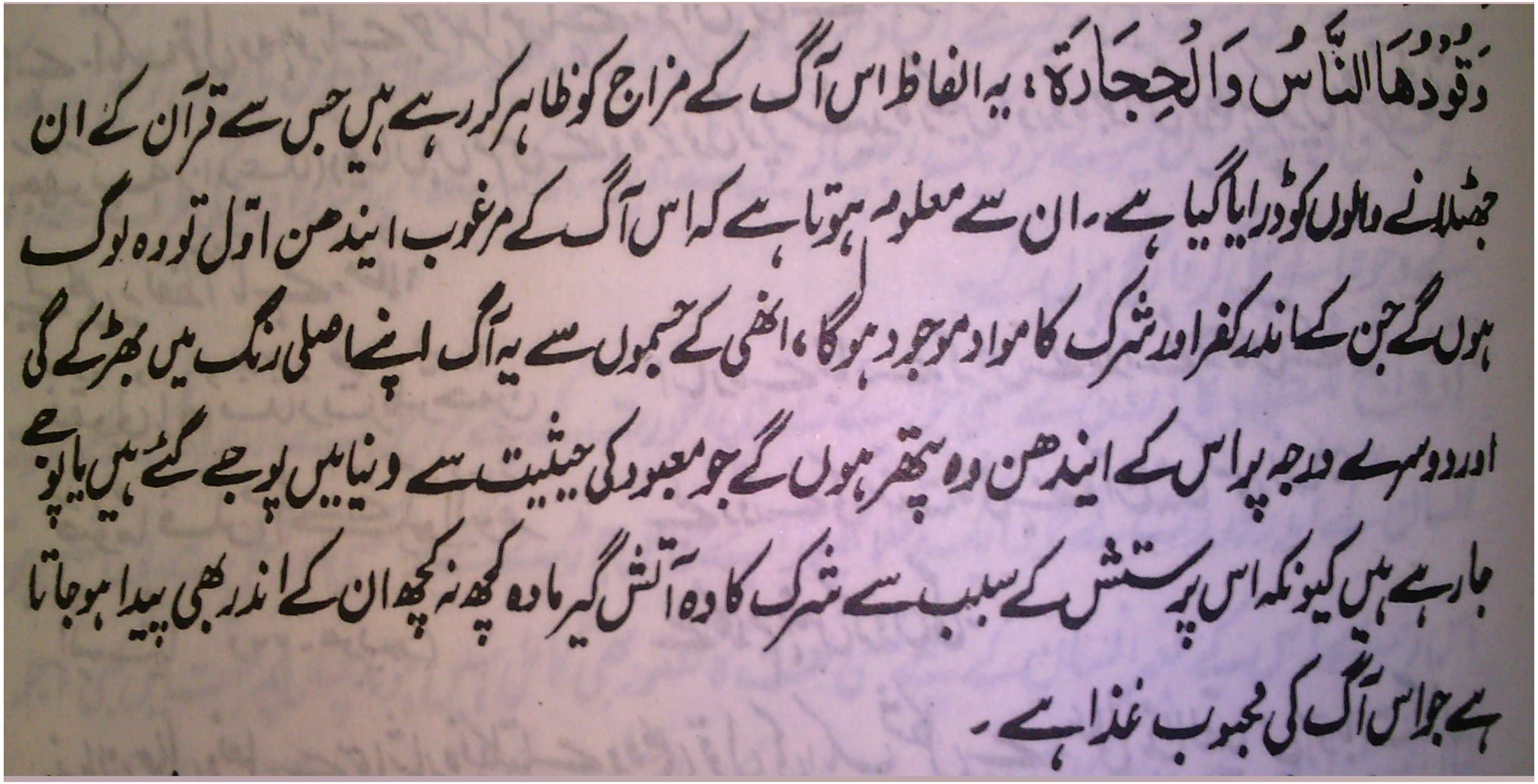

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ؛ یہ الفاظ اس آگ کے مزاج کو ظاہر کر رہے ہیں جس سے قرآن کے ان جھٹلانے والوں کو ڈرایا گیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آگ کے مرغوب ایندھن اوّل تو وہ لوگ ہوں گے جن کے اندر کفر اور شرک کا مواد موجود ہوگا، انھی کے جسموں سے یہ آگ اپنے اصلی رنگ میں بھڑکے گی اور دوسرے درجہ پر اس کے ایندھن وہ پتھر ہوں گے جو معبود کی حیثیت سے دنیا میں پوجے گئے ہیں یا پوجے جا رہے ہیں کیونکہ اس پرستش کے سبب سے شرک کا وہ آتش گیر مادہ کچھ نہ کچھ ان کے اندر بھی پیدا ہو جاتا ہے جو اس آگ کی محبوب غذا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی ؒ (تدبُّر قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

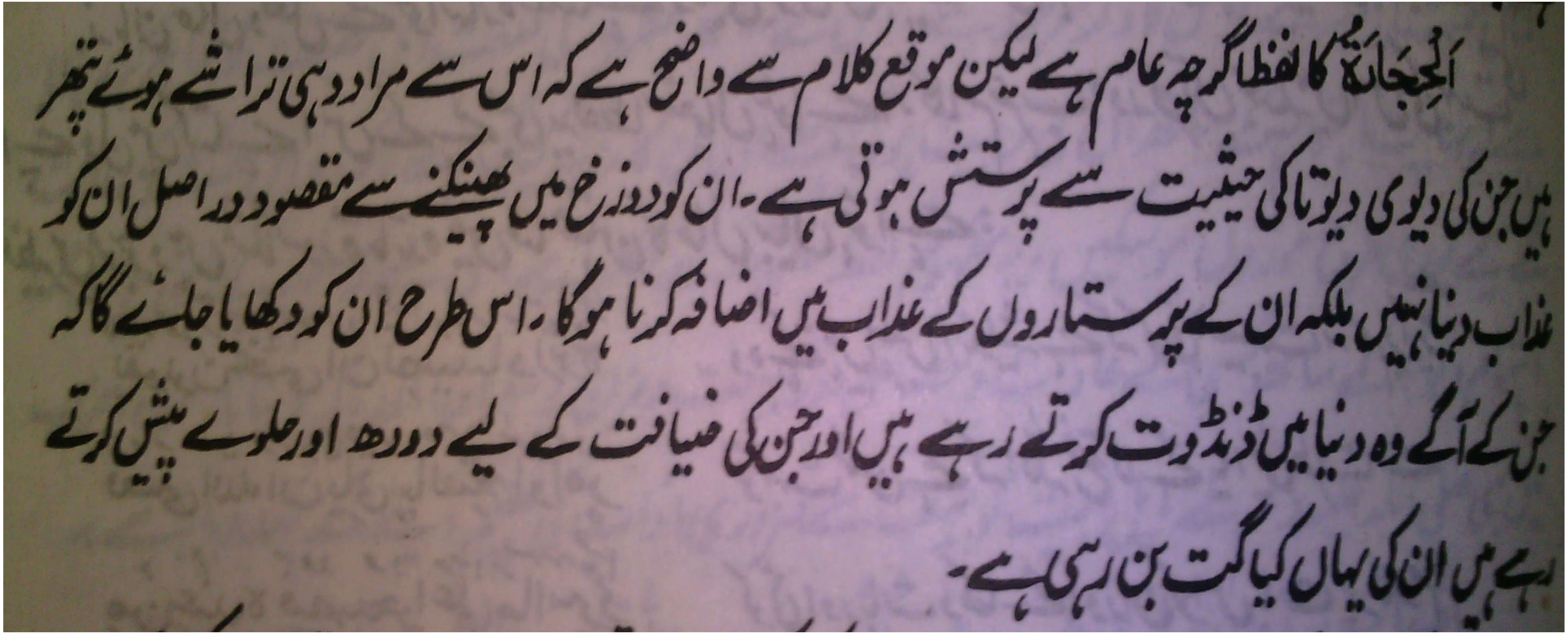

اَلْحِجَارَۃُ کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن موقع کلام سے واضح ہے کہ اس سے مراد وہی تراشے ہوئے پتھر ہیں جن کی دیوی دیوتا کی حیثیت سے پرستش ہوتی ہے۔ ان کو دوزخ میں پھینکنے سے مقصود در اصل ان کو عذاب دینا نہیں بلکہ ان کے پرستاروں کے عذاب میں اضافہ کرنا ہوگا۔ اس طرح ان کو دکھایا جائے گا کہ جن کے آگے وہ دنیا میں ڈنڈوت کرتے رہے ہیں اور جن کی ضیافت کے لیے دودھ اور حلوے پیش کرتے رہے ہیں ان کی یہاں کیا گت بن رہی ہے۔

مولانا ادریس کاندھلویؒ (معارف القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

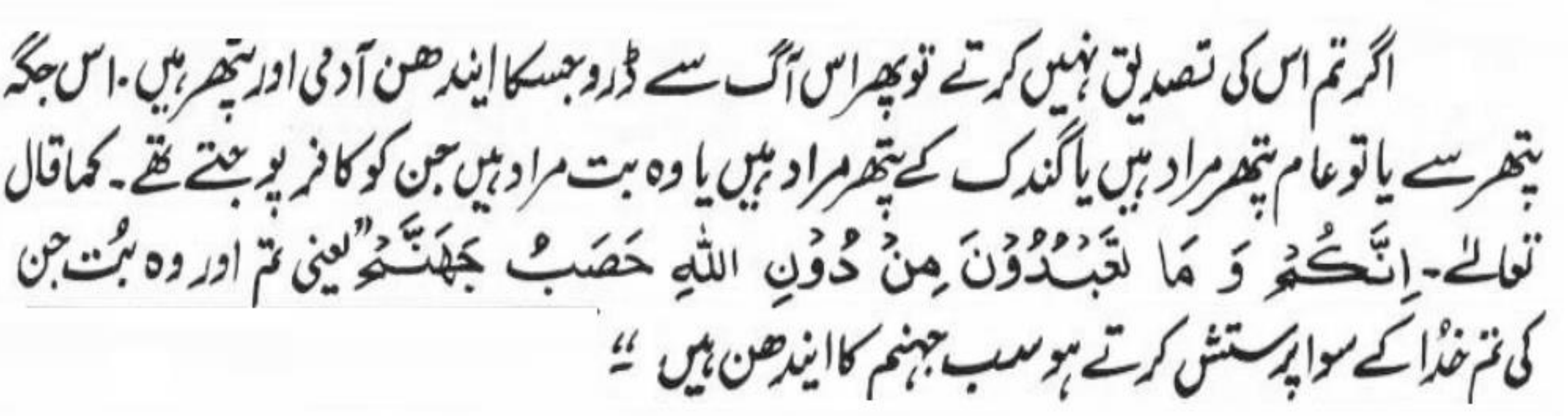

اگر تم اس کی تصدیق نہیں کرتے تو پھر اس آگ سے ڈرو جسکا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ اس جگہ پتھر سے یا تو عام پتھر مراد ہیں یا گندک کے پتھر مراد ہیں یا وہ بت مراد ہیں جن کو کافر پوجتے تھے۔ کما قال تعالیٰ۔ اِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ”یعنی تم اور وہ بت جن کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن ہیں“

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (تفسیر عثمانی میں) فرماتے ہیں کہ:

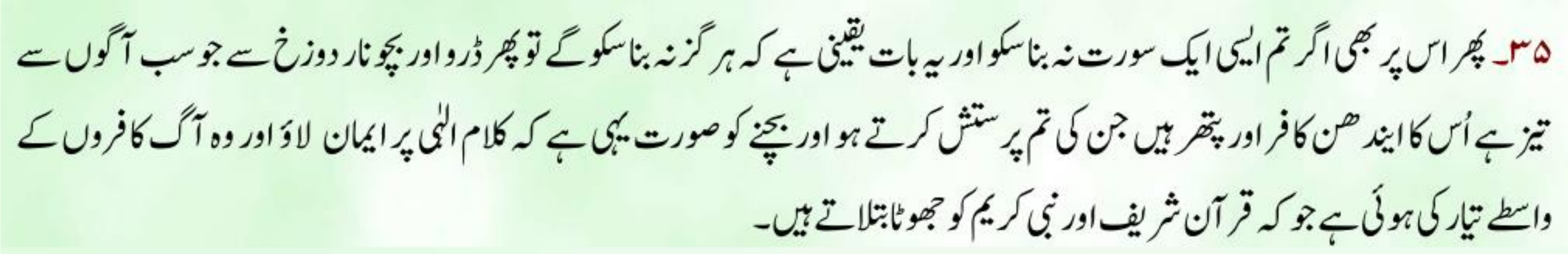

۳۵۔ پھر اس پر بھی اگر تم ایسی ایک سورت نہ بنا سکو اور یہ بات یقینی ہے کہ ہرگز نہ بنا سکو گے تو پھر ڈرو اور بچو نار دوزخ سے جو سب آگوں سے تیز ہے اُس کا ایندھن کافر اور پتھر ہیں جن کی تم پرستش کرتے ہو اور بچنے کو صورت یہی ہے کہ کلام الٰہی پر ایمان لاؤ اور وہ آگ کافروں کے واسطے تیار کی ہوئی ہے جو کہ قرآن شریف اور نبی کریم کو جھوٹا بتلاتے ہیں۔

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

(۱۹) پچھلی آیات میں توحید کا بیان تھا، اب اسلام کے دُوسرے اہم عقیدے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بیان ہے، اور عرب کے جو لوگ قرآن پر اِیمان لانے کے بجائے یہ الزام لگاتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شاعر ہیں اور انہوں نے اپنی طرف سے یہ کلام بنالیا ہے، انہیں زبردست چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر ایسا کلام کوئی انسان بنا سکتا ہے تو تم بڑے فصیح و بلیغ ہو، تم سب مل کر قرآن جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا کر لے آؤ، ساتھ ہی قرآن نے دعویٰ کیا ہے کہ تم سب مل کر بھی ایسا نہیں کرسکو گے۔ اور واقعہ یہی ہے کہ اہلِ عرب جو اپنی زبان وادب پر ناز کرتے تھے، ان سب کو اس چیلنج کے بعد سانپ سونگھ گیا، اور کوئی شخص یہ چیلنج قبول کرنے کے لئے آگے نہ بڑھا، بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں نے اس خدائی کلام کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے، اور اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآنِ کریم کی سچائی روزِ روشن کی طرح ثابت اور واضح ہوگئی۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ (تیسیر القرآن میں) فرماتے ہیں کہ :

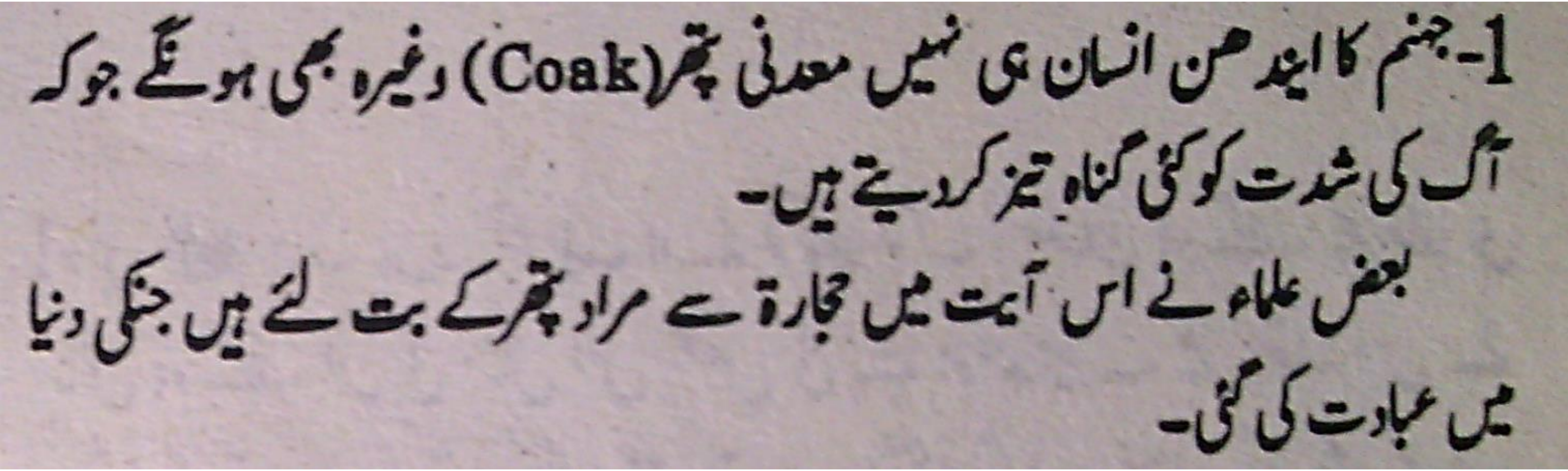

1- جہنم کا ایندھن انسان ہی نہیں معدنی پتھر(Coak) وغیرہ بھی ہونگے جو کہ آگ کی شدت کو کئی گناہ تیز کردیتے ہیں۔

بعض علماء نے اس آیت میں حجارۃ سے مراد پتھر کے بت لئے ہیں جنکی دنیا میں عبادت کی گئی۔

اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ
وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵

مولانا ادریس کاندھلویؒ (معارف القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

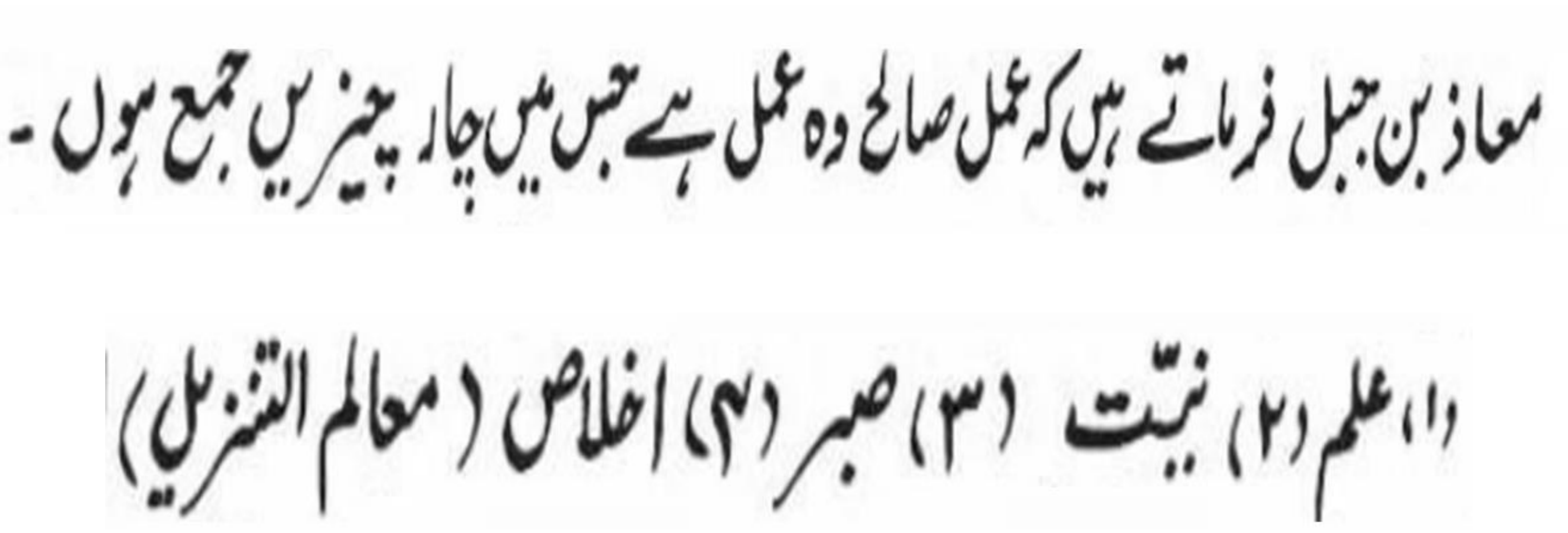

معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ عمل صالح وہ عمل ہے جس میں چار چیزیں جمع ہوں۔

(۱) علم (۲) نیّت (۳) صبر (۴) اخلاص (معالم التنزیل)

مولانا ادریس کاندھلویؒ (معارف القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

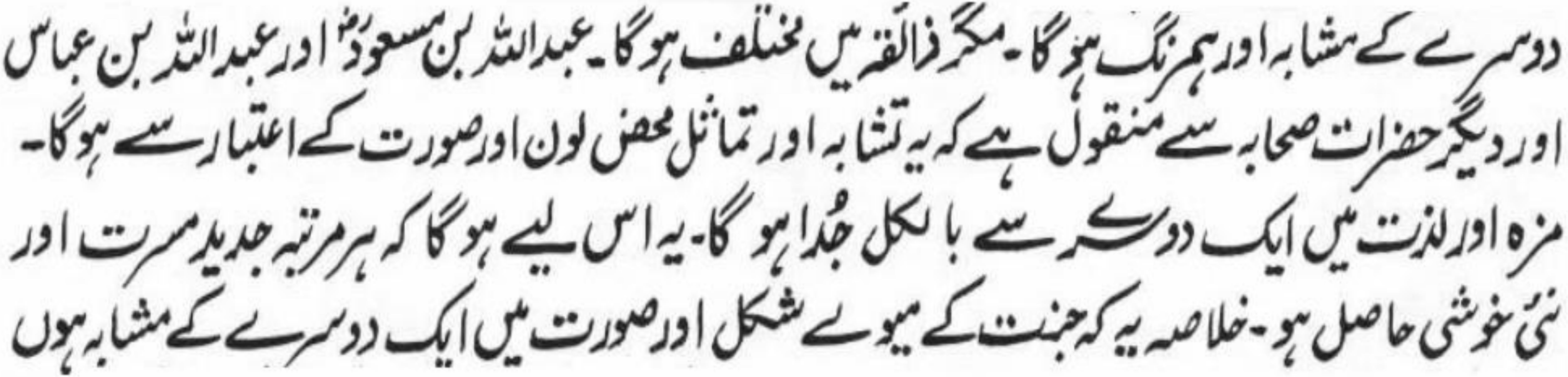

دوسرے کے مشابہ اور ہم رنگ ہو گا۔ مگر ذائقہ میں مختلف ہو گا۔ عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباس اور دیگر حضرات صحابہ سے منقول ہے کہ یہ تشابہ اور تماثل محض لون اور صورت کے اعتبار سے ہو گا۔ مزہ اور لذت میں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو گا۔ یہ اس لیے ہو گا کہ ہر مرتبہ جدید مسرت اور نئی خوشی حاصل ہو۔ خلاصہ یہ کہ جنت کے میوے شکل اور صورت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں

مولانا ادریس کاندھلویؒ (معارف القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

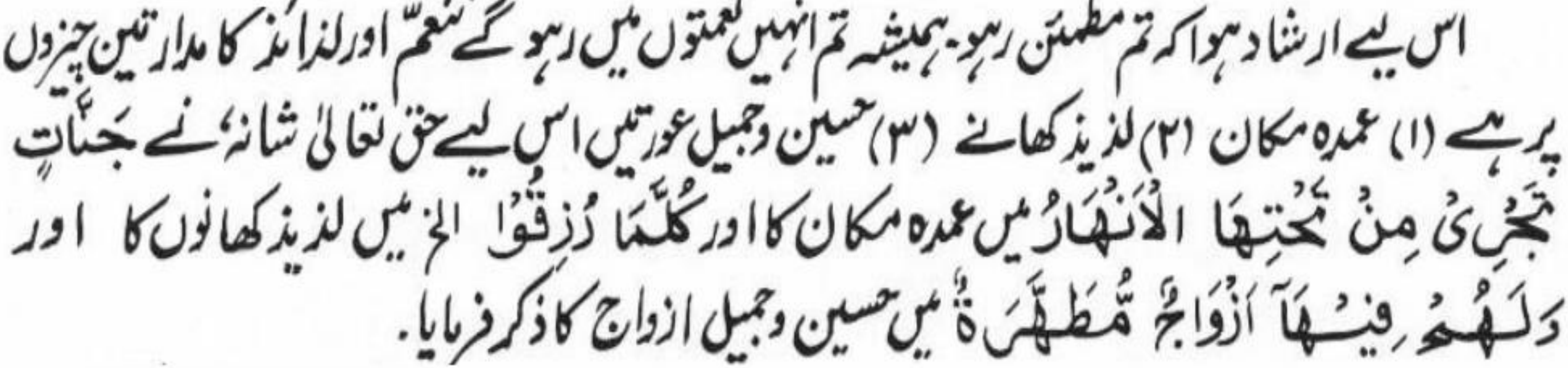

اس لیے ارشاد ہوا کہ تم مطمئن رہو۔ ہمیشہ تم انہیں نعمتوں میں رہو گے تنعّم اور لذائذ کا مدار تین چیزوں پر ہے (۱) عمدہ مکان (۲) لذیذ کھانے (۳) حسین وجمیل عورتیں اس لیے حق تعالیٰ شانہٗ نے جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ میں عمدہ مکان کا اور كُلَّمَا رُزِقُوْا الخ میں لذیذ کھانوں کا اور وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ میں حسین وجمیل ازواج کا ذکر فرمایا۔

مولانا ادریس کاندھلویؒ (معارف القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

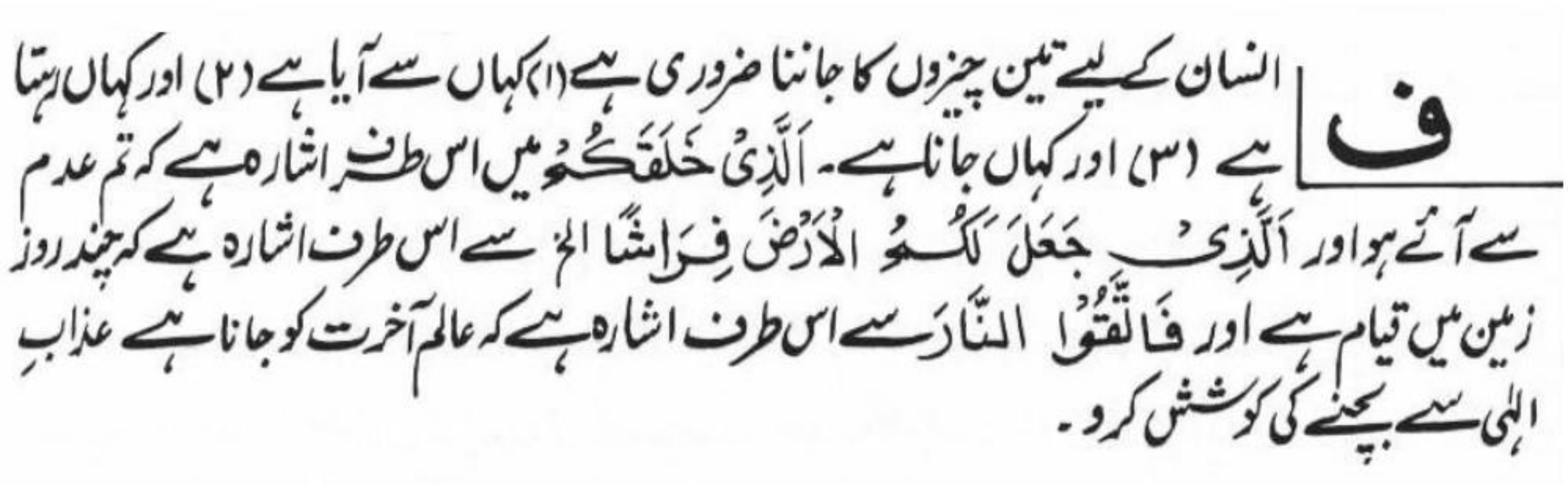

ف انسان کے لیے تین چیزوں کا جاننا ضروری ہے (۱) کہاں سے آیا ہے (۲) اور کہاں رہتا ہے (۳) اور کہاں جانا ہے۔ اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ میں اس طرف اشارہ ہے کہ تم عدم سے آئے ہو اور اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا الخ سے اس طرف اشارہ ہے کہ چند روز زمین میں قیام ہے اور فَاتَّقُوا النَّارَ سے اس طرف اشارہ ہے کہ عالم آخرت کو جانا ہے عذابِ الٰہی سے بچنے کی کوشش کرو۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (تفسیر عثمانی میں) فرماتے ہیں کہ:

۳۶۔ **جنّت کے پھل:** جنّت کے میوے دنیا کے میووں کی سی شکل وصورت میں ملتے جلتے ہوں گے مگر لذت میں زمین و آسمان کا فرق ہو گا یا جنّت کے میوے باہم ایک شکل وصورت کے ہوں گے اور مزا جدا جدا تو جب کسی میوے کو دیکھیں گے تو کہیں گے وہی قِسم ہے جو پہلے دنیا میں یا جنّت میں کھا چکے ہیں اور چکھیں گے تو مزہ اور ہی پائیں گے۔

۳۷۔ **جنّت کی عورتیں:** جنّت کی عورتیں نجاسات ظاہرہ و باطنہ (اخلاق رذیلہ) سے پاک وصاف ہوں گی فائدہ: یہاں تک تین چیزیں جن کا جاننا ضروری تھا بیان فرمائیں اوّل مبداء (یعنی ہم کہاں سے آئے اور کیا تھے) دوسرے معاش (کہ کیا کھائیں اور کہاں رہیں) تیسرے معاد (کہ ہمارا انجام کیا ہے)۔

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

(۲۱) اس کا مطلب ایک تو یہ ہو سکتا ہے کہ جنت ہی میں انہیں وقفوں وقفوں سے ایسے پھل دیئے جائیں گے جو دیکھنے میں بالکل ملتے جلتے ہوں گے، مگر لذت اور ذائقے میں ہر پھل نیا ہو گا اور دُوسرا مطلب یہ بھی ممکن ہے کہ جنت کے پھل دیکھنے میں دُنیا کے پھلوں کی طرح ہوں گے، اس لئے انہیں دیکھ کر جنتی یہ کہیں گے کہ یہ تو وہی پھل ہیں جو ہمیں پہلے یعنی دُنیا میں ملے تھے، لیکن جنت میں ان کی لذت اور خصوصیات دُنیا کے پھلوں سے کہیں زیادہ ہوں گی۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ (بیان القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

﴿وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ﴾ ''اور دیے جائیں گے ان کو پھل ایک صورت کے۔''

اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ جنت میں اہل جنت کی جو ابتدائی دعوت یا ابتدائی ضیافت (نُـــزُل) ہو گی اس میں انہیں وہی پھل پیش کیے جائیں گے جو دنیا میں معروف ہیں، مثلاً انار، انگور، سیب، کھجور وغیرہ۔ اہلِ جنت انہیں دیکھ کر کہیں گے کہ یہ تو وہی پھل ہیں جو ہم دنیا میں کھاتے آئے ہیں، لیکن جب انہیں چکھیں گے تو ظاہری مشابہت کے باوجود ذائقے میں زمین و آسمان کا فرق پائیں گے۔ اور ایک مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ اہل جنت کو جنت میں بھی وہی پھل ملتے رہیں گے، لیکن ہر بار اُن کا ذائقہ بدلتا رہے گا۔ ان کی شکل و صورت وہی رہے گی، لیکن ذائقہ وہ نہیں رہے گا۔ لہٰذا یہ دنیا والا معاملہ نہیں ہو گا کہ ایک ہی شے کو کھاتے کھاتے انسان کی طبیعت بھر جاتی ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ (تیسیر القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

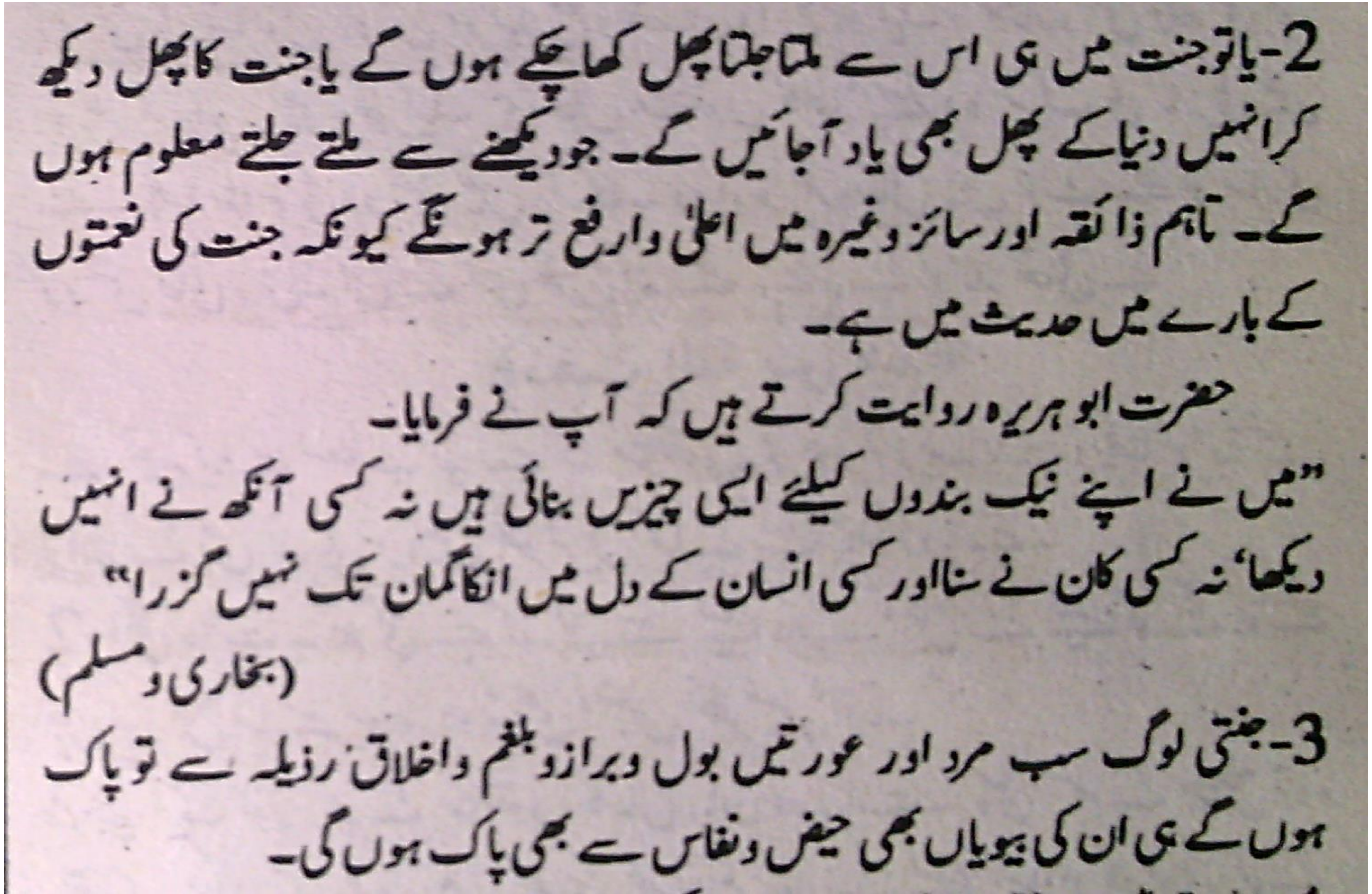

2-یا تو جنت میں ہی اس سے ملتا جلتا پھل کھا چکے ہوں گے یا جنت کا پھل دیکھ کر انہیں دنیا کے پھل بھی یاد آجائیں گے۔ جو دیکھنے سے ملتے جلتے معلوم ہوں گے۔ تاہم ذائقہ اور سائز وغیرہ میں اعلیٰ وارفع تر ہونگے کیونکہ جنت کی نعمتوں کے بارے میں حدیث میں ہے۔

حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

"میں نے اپنے نیک بندوں کیلئے ایسی چیزیں بنائی ہیں نہ کسی آنکھ نے انہیں دیکھا' نہ کسی کان نے سنا اور کسی انسان کے دل میں انکا گمان تک نہیں گزرا"

(بخاری ومسلم)

3-جنتی لوگ سب مرد اور عورتیں بول وبراز وبلغم واخلاق رذیلہ سے تو پاک ہوں گے ہی ان کی بیویاں بھی حیض ونفاس سے بھی پاک ہوں گی۔

اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ
بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ﴿۲۶﴾

مولانا ادریس کاندھلویؒ (معارف القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

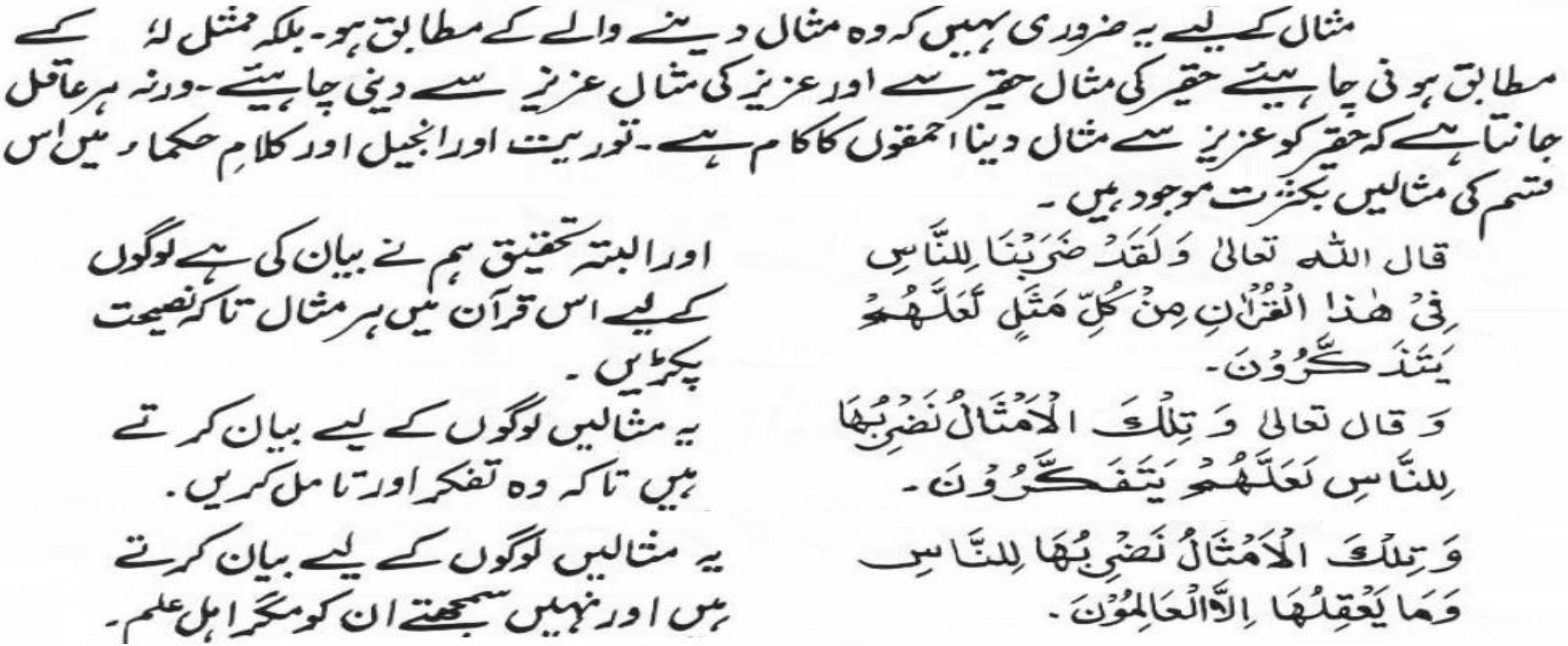

مثال کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ مثال دینے والے کے مطابق ہو۔ بلکہ ممثل لہٗ کے مطابق ہونی چاہیئے حقیر کی مثال حقیر سے اور عزیز کی مثال عزیز سے دینی چاہیئے۔ ورنہ ہر عاقل جانتا ہے کہ حقیر کو عزیز سے مثال دینا احمقوں کا کام ہے۔ توریت اور انجیل اور کلامِ حکماء میں اس قسم کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

قال اللّٰہ تعالیٰ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔	اور البتہ تحقیق ہم نے بیان کی ہے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر مثال تاکہ نصیحت پکڑیں۔
وَ قال تعالیٰ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔	یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ تفکر اور تامل کریں۔
وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ۔	یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے ان کو مگر اہل علم۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (تفسیر عثمانی میں) فرماتے ہیں کہ:

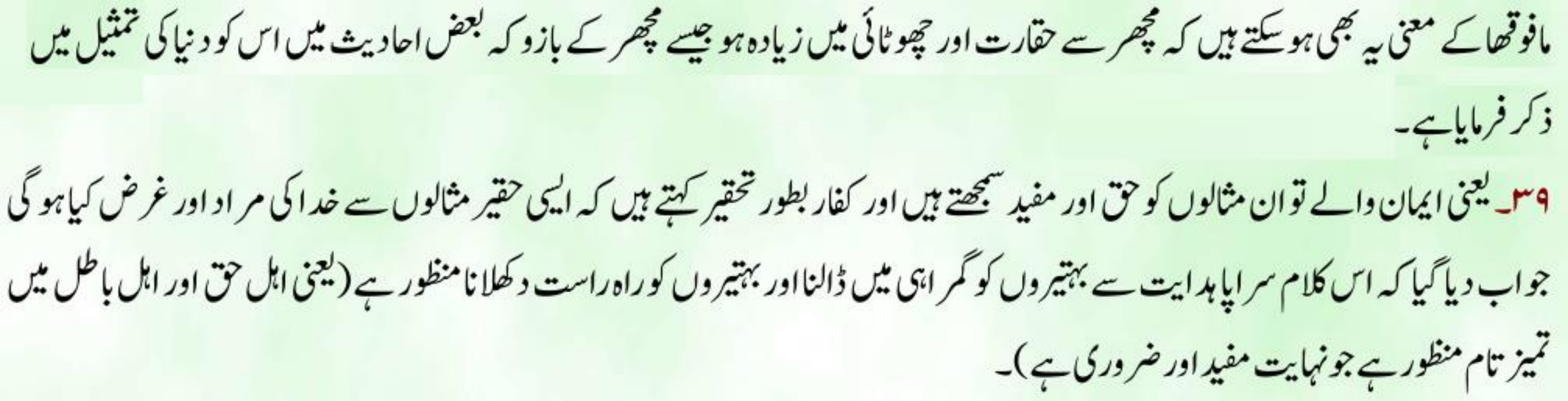

مافوقہا کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مچھر سے حقارت اور چھوٹائی میں زیادہ ہو جیسے مچھر کے بازو کہ بعض احادیث میں اس کو دنیا کی تمثیل میں ذکر فرمایا ہے۔

۳۹۔ یعنی ایمان والے تو ان مثالوں کو حق اور مفید سمجھتے ہیں اور کفار بطور تحقیر کہتے ہیں کہ ایسی حقیر مثالوں سے خدا کی مراد اور غرض کیا ہو گی جواب دیا گیا کہ اس کلام سراپا ہدایت سے بہتیروں کو گمراہی میں ڈالنا اور بہتیروں کو راہ راست دکھلانا منظور ہے (یعنی اہل حق اور اہل باطل میں تمیز تام منظور ہے جو نہایت مفید اور ضروری ہے)۔

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

(۲۲) بعض کافروں نے قرآنِ کریم پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اس میں کچھ مثالیں مکھی، مچھر، مکڑی وغیرہ کی دی گئی ہیں، اگر یہ واقعی خدا کا کلام ہوتا تو اس میں ایسی حقیر چیزوں کا ذکر نہ ہوتا۔ ظاہر ہے کہ یہ اعتراض بڑا بے تکا اعتراض تھا، کیونکہ مثال ہمیشہ مضمون کی مناسبت سے دی جاتی ہے، اگر کسی حقیر و ذلیل چیز کی مثال دینی ہو تو ایسی ہی کسی چیز سے دی جائے گی جو حقیر و ذلیل ہو۔ یہ کسی کلام کا عیب تو کیا ہوتا؟ اُس کی فصاحت و بلاغت کی دلیل ہے، مگر یہ بات انہی کی سمجھ میں آتی ہے جو طالبِ حق ہوں اور حق پر ایمان لا چکے ہوں، لیکن جنہوں نے کفر کی قسم کھا رکھی ہے، انہیں تو ہر بات پر ہر حالت میں اعتراض کرنا ہے، اس لئے وہ ایسی بے تکی باتیں کہتے ہیں۔

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

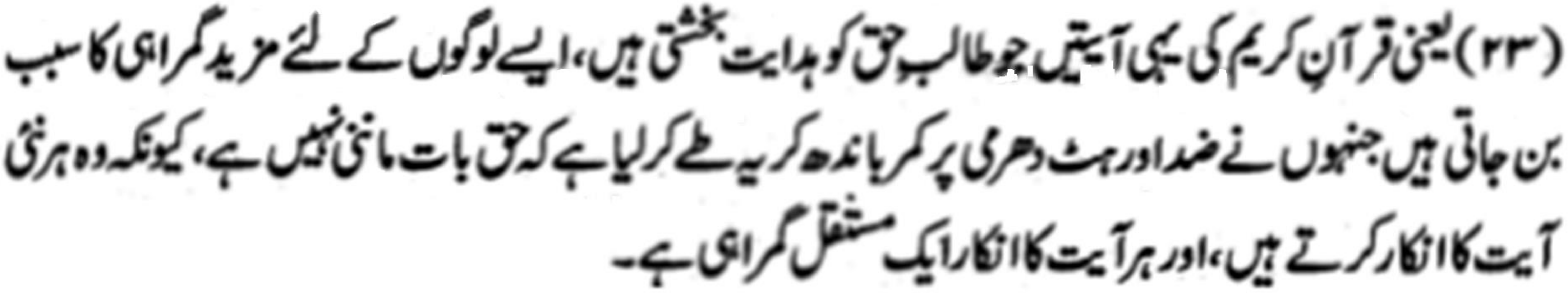

(۲۳) یعنی قرآن کریم کی یہی آیتیں جو طالب حق کو ہدایت بخشتی ہیں، ایسے لوگوں کے لئے مزید گمراہی کا سبب بن جاتی ہیں جنہوں نے ضد اور ہٹ دھرمی پر کمر باندھ کر یہ طے کرلیا ہے کہ حق بات ماننی نہیں ہے، کیونکہ وہ ہر نئی آیت کا انکار کرتے ہیں، اور ہر آیت کا انکار ایک مستقل گمراہی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ (بیان القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

اِن مثالوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ بہت سوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہت سوں کو راہِ راست دکھا دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہدایت اور گمراہی کا دار و مدار انسان کی اپنی داخلی کیفیت (subjective condition) پر ہے۔ آپ کے دل میں خیر ہے، بھلائی ہے، آپ کی نیت طلبِ ہدایت اور طلبِ علم کی ہے تو آپ کو اس قرآن سے ہدایت مل جائے گی، اور اگر دل میں زیغ ہے، کجی ہے، نیت میں ٹیڑھ اور فساد ہے تو اسی کے ذریعے سے اللہ آپ کی گمراہی میں اضافہ کر دے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا کسی کو ہدایت دینا اور کسی کو گمراہی میں مبتلا کر دینا اَلل ٹپ نہیں ہے، کسی قاعدے اور قانون کے بغیر نہیں ہے۔

﴿وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝٢٦﴾ ”اور نہیں گمراہ کرتا وہ اس کے ذریعے سے مگر صرف سرکش لوگوں کو۔“ اس سے گمراہی میں وہ صرف انہی کو مبتلا کرتا ہے جن میں سرکشی ہے، تعدّی ہے، تکبر ہے۔ اگلی آیت میں اُن کے اوصاف بیان کر دیے گئے۔

اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۖ وَ يَقْطَعُوْنَ

مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ

اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۲۷

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (تفسیر عثمانی میں) فرماتے ہیں کہ:

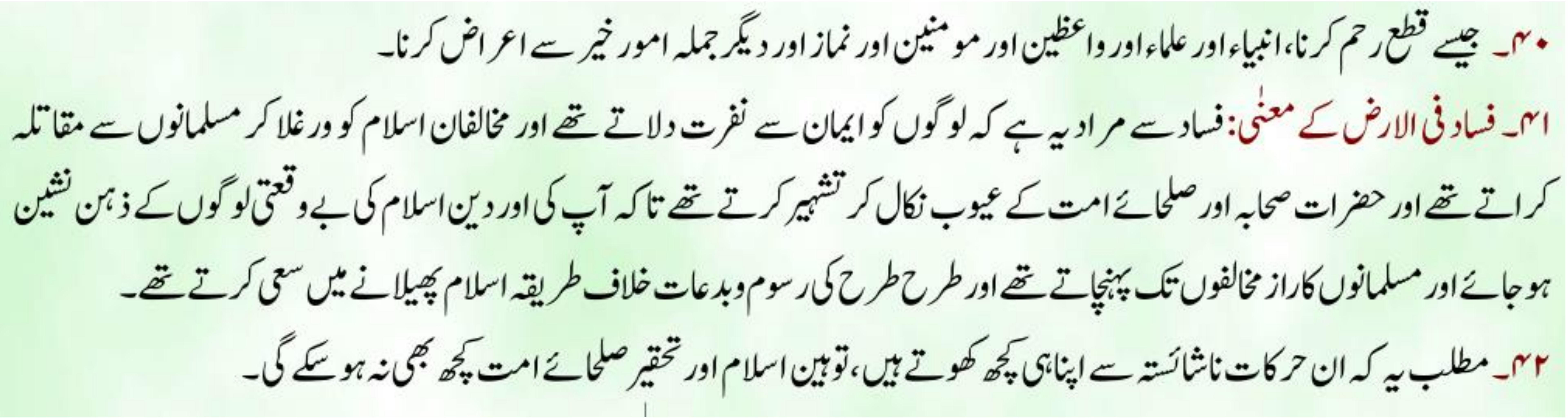

۴۰۔ جیسے قطع رحم کرنا، انبیاء اور علماء اور واعظین اور مومنین اور نماز اور دیگر جملہ امور خیر سے اعراض کرنا۔

۴۱۔ **فساد فی الارض کے معنٰی:** فساد سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو ایمان سے نفرت دلاتے تھے اور مخالفان اسلام کو ورغلا کر مسلمانوں سے مقاتلہ کراتے تھے اور حضرات صحابہ اور صلحائے امت کے عیوب نکال کر تشہیر کرتے تھے تاکہ آپ کی اور دین اسلام کی بے وقعتی لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے اور مسلمانوں کا راز مخالفوں تک پہنچاتے تھے اور طرح طرح کی رسوم وبدعات خلاف طریقہ اسلام پھیلانے میں سعی کرتے تھے۔

۴۲۔ مطلب یہ کہ ان حرکات ناشائستہ سے اپنا ہی کچھ کھوتے ہیں، توہین اسلام اور تحقیر صلحائے امت کچھ بھی نہ ہو سکے گی۔

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

(۲۴) عہد سے مراد اکثر مفسرین نے وہ عہدِ اَلست لیا ہے جس کا ذکر سورۂ اعراف (۷:۱۷۲) میں آنے والا ہے، وہیں اِن شاء اللہ اس کی تفصیل آئے گی، یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کرنے سے بہت پہلے آنے والی تمام روحوں کو جمع کر کے ان سے پوچھا تھا کہ "کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟" سب نے اللہ تعالیٰ کے پروردگار ہونے کا اقرار کر کے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے۔ پھر اس آیت میں عہد کو پختہ کرنے سے مراد بظاہر یہ ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ کے رسول آتے رہے جو اس عہد کو یاد دِلا کر اللہ تعالیٰ کے خالق و مالک ہونے پر دلائل قائم کرتے رہے۔

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

اِس عہد کی ایک اور تشریح بھی ممکن ہے، اور وہ یہ کہ اس سے مراد وہ عملی اور خاموش عہد (Tacit Covenant) ہے جو ہر اِنسان پیدا ہوتے ہی اپنے خالق و مالک سے کرتا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے ہر شخص جو کسی ملک میں پیدا ہوتا ہے وہ اس ملک کا شہری ہونے کے ناتے یہ خاموش عہد کرتا ہے کہ وہ اس ملک کے قوانین کا پابند ہوگا۔ خواہ زبان سے اس نے کچھ نہ کہا ہو، لیکن اس کا کسی ملک میں پیدا ہونا ہی اس عہد کے قائم مقام ہے۔ اسی طرح اس کائنات میں جو شخص بھی پیدا ہوتا ہے وہ خود بخود اس عہد کا پابند ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کرے گا۔ اس عہد کے لئے زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اگلی آیت میں باری تعالیٰ نے فوراً یہ ارشاد فرمایا کہ "تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کا طرزِ عمل آخر کیسے اختیار کرلیتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے، اُسی نے تمہیں زندگی بخشی"، یعنی اگر ذرا غور کرو تو تنہا یہ بات کہ کسی نے تمہیں پیدا کیا ہے، تمہاری طرف سے یہ عہد و پیمان ہے کہ تمہارے لئے اس کی نعمتوں کا اعتراف اور اُس کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنا لازمی ہوگا۔ ورنہ یہ کونسی عقل اور کونسا انصاف ہے کہ پیدا تو اللہ تعالیٰ کرے، اور فرمانبرداری اس کے بجائے کسی اور کی کی جائے، پھر اس خاموش عہد کو مزید پختہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے ذریعے متواتر تمہیں اس عہد کی یاد دہانی کراتا رہا ہے، اور ان پیغمبروں نے وہ مضبوط دلائل تمہارے سامنے پیش کئے ہیں جن سے یہ عہد مزید پختہ ہوگیا ہے کہ انسان کو ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنی ہے۔

اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں

کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَ کُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ۚ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ

ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ۝٢٨

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (تفسیر عثمانی میں) فرماتے ہیں کہ:

یعنی اجسام بے جان کہ حس و حرکت کچھ بھی نہ تھی اول عناصر تھے اس کے بعد والدین کی غذا بنے، پھر نطفہ پھر خون بستہ پھر گوشت۔ **وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا**

۴۴۔ یعنی حالات سابقہ کے بعد نفخ روح کیا گیا جس سے رحم مادر میں اور اس کے بعد دنیا میں زندہ رہے۔ **فَاَحْيَاكُمْ**

۴۵۔ یعنی جب دنیا میں وقت مرنے کا آئے گا۔ **ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ**

۴۶۔ یعنی قیامت کو زندہ کئے جاؤ گے حساب لینے کے واسطے۔ **ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ**

۴۷۔ یعنی قبروں سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے روبرو حساب و کتاب کے واسطے کھڑے کئے جاؤ گے، سو اب انصاف کرو کہ جب تم اول سے آخر تک اللہ تعالیٰ کے احسانات کے مرہون ہو اور ہر حالت میں اور حاجت میں اس کے محتاج ہو اور اس کے متوقع ہو۔ پھر اس پر بھی کفر کرنا اور اس کی نافرمانی کرنا کس قدر تعجب خیز امر ہے۔ **ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ**

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ (تیسیر القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

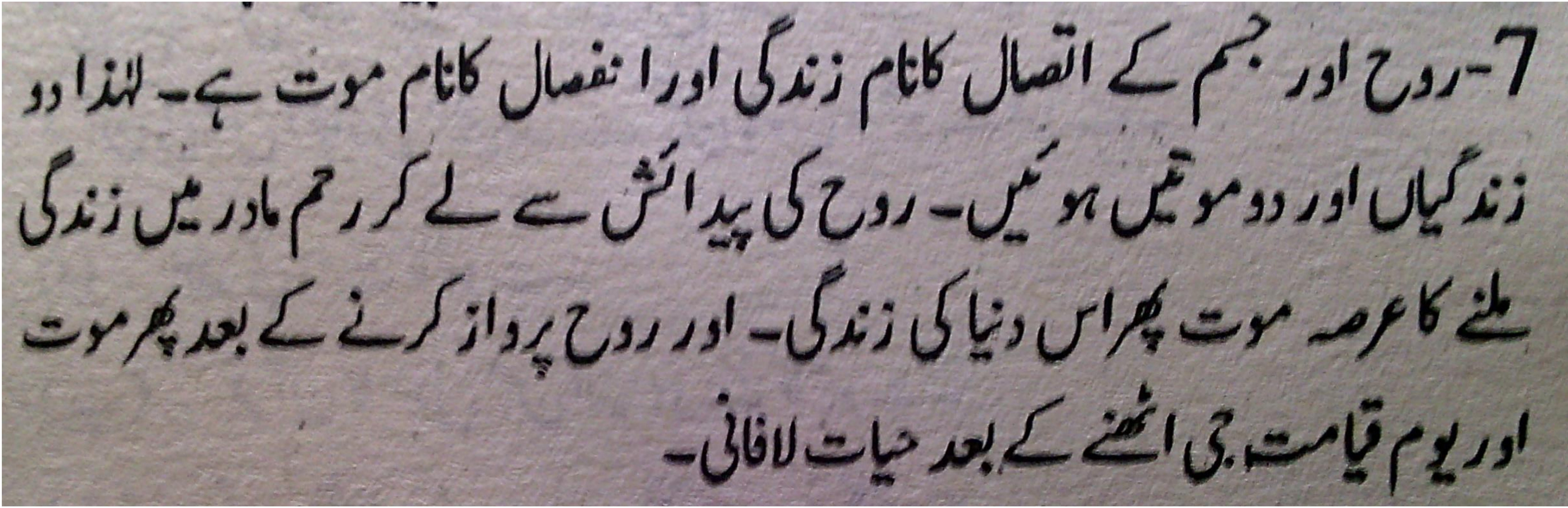

7- روح اور جسم کے اتصال کا نام زندگی اور انفصال کا نام موت ہے۔ لہٰذا دو زندگیاں اور دو موتیں ہوئیں۔ روح کی پیدائش سے لے کر رحم مادر میں زندگی ملنے کا عرصہ موت پھر اس دنیا کی زندگی۔ اور روح پرواز کرنے کے بعد پھر موت اور یوم قیامت جی اٹھنے کے بعد حیات لافانی۔

اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں

هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ لَكُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ۚ ثُمَّ اسۡتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ
فَسَوّٰٮهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۲۹﴾ ع

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ :

اسی آیت سے فقہاء نے یہ اُصول بھی مستنبط کیا ہے کہ دُنیا کی ہر چیز اصل میں حلال ہے اور جب تک کسی چیز کی حرمت پر کوئی دلیل نہ ہو اس وقت تک اس کو حلال ہی سمجھا جائے گا۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ (بیان القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

اس آیت میں خلافت کا مضمون شروع ہو گیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے: ((اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ)) (٤) ''یہ دنیا تمہارے لیے بنائی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے بنائے گئے ہو۔'' اگلی آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کی خلافتِ ارضی کا ذکر ہے۔ گویا زمین میں جو کچھ بھی پیدا کیا گیا ہے وہ انسان کی خلافت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ط﴾ ''پھر وہ متوجہ ہوا آسمانوں کی طرف اور انہیں ٹھیک ٹھیک سات آسمانوں کی شکل میں بنا دیا۔''

یہ آیت تاحال آیاتِ متشابہات میں سے ہے۔ سات آسمانوں کی کیا حقیقت ہے، ہم ابھی تک پورے طور پر اس سے واقف نہیں ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ (تیسیر القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

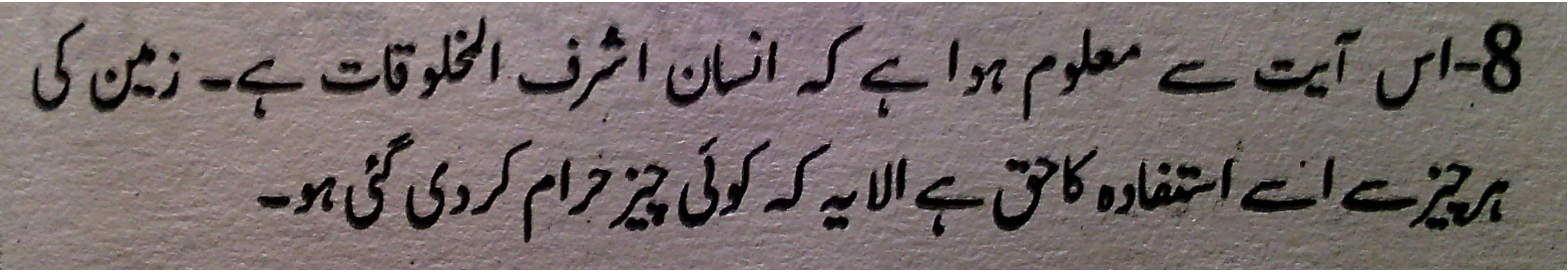

8-اس آیت سے معلوم ہوا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ زمین کی ہر چیز سے اسے استفادہ کا حق ہے الا یہ کہ کوئی چیز حرام کردی گئی ہو۔

اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا
اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ
بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ (تیسیر القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

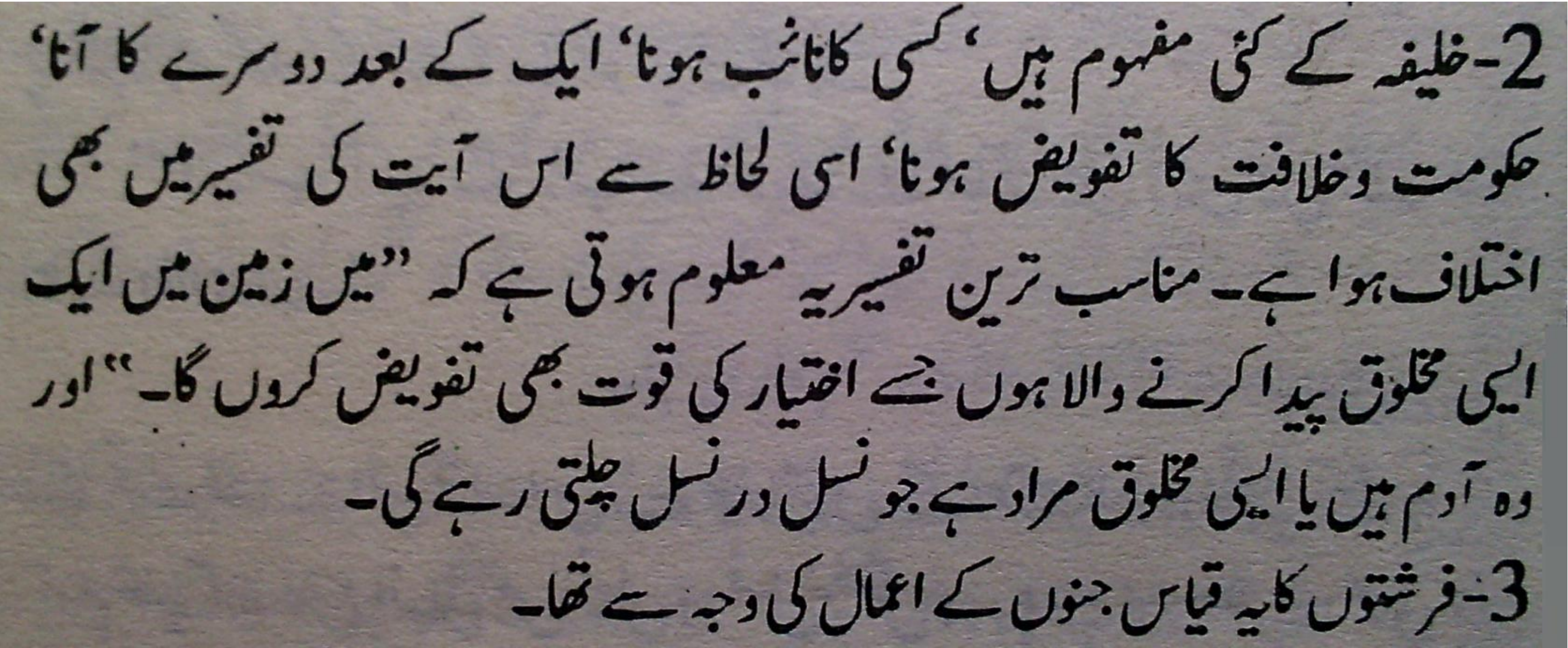

2- خلیفہ کے کئی مفہوم ہیں، کسی کا نائب ہونا، ایک کے بعد دوسرے کا آنا، حکومت وخلافت کا تفویض ہونا، اسی لحاظ سے اس آیت کی تفسیر میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ مناسب ترین تفسیر یہ معلوم ہوتی ہے کہ "میں زمین میں ایک ایسی مخلوق پیدا کرنے والا ہوں جسے اختیار کی قوت بھی تفویض کروں گا۔" اور وہ آدم ہیں یا ایسی مخلوق مراد ہے جو نسل در نسل چلتی رہے گی۔

3- فرشتوں کا یہ قیاس جنوں کے اعمال کی وجہ سے تھا۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ (تیسیر القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

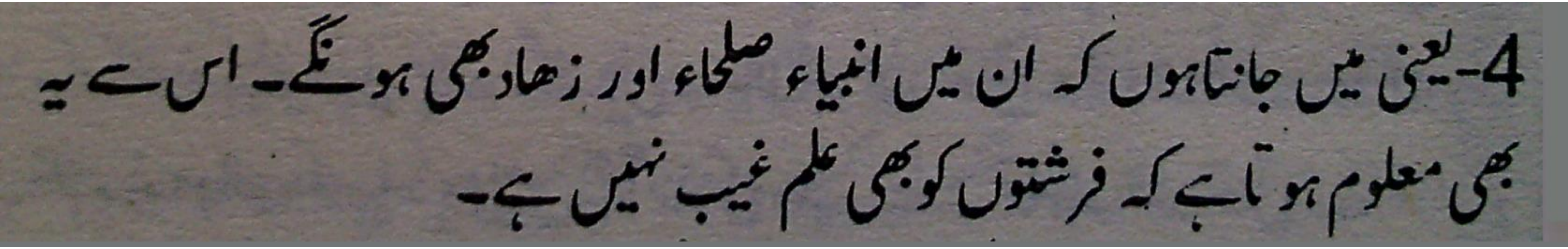

4-یعنی میں جانتا ہوں کہ ان میں انبیاء صلحاء اور زہاد بھی ہونگے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو بھی علم غیب نہیں ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (تفسیر عثمانی میں) فرماتے ہیں کہ:

۵۰۔ ملائکہ کا سوال اور اُس کا جواب: ملائکہ کو جب یہ خلجان ہوا کہ ایسی مخلوق کہ جس میں مفسد اور خونریز تک ہوں گے ہم ایسے مطیع اور فرمانبردار کے ہوتے اُن کو خلیفہ بنانا اس کی وجہ کیا ہوگی؟ تو بطریق استفادہ یہ سوال کیا۔ اعتراض ہرگز نہ تھا۔ رہا یہ امر کہ ملائکہ کو بنی آدم کا حال کیونکر معلوم ہوا اس میں بہت سے احتمال ہیں۔ جنّات پر قیاس کیا یا حق تعالیٰ نے پہلے بتادیا تھا یا لوح محفوظ پر لکھا دیکھا۔ یا سمجھ گئے کہ حاکم و خلیفہ کی ضرورت جب ہی ہوگی جب ظلم و فساد ہوگا یا حضرت آدمؑ کے قالب کو دیکھ کر بطور قیافہ سمجھ گئے ہوں (جیسا ابلیس نے حضرت آدمؑ کو دیکھ کر کہا تھا کہ بھکول ہوں گے) اور ایسا ہی ہوا۔

۵۱۔ فرشتوں کو سر دست بالاجمال یہ جواب دیا گیا کہ ہم خوب جانتے ہیں اس کے پیدا کرنے میں جو حکمتیں ہیں۔ تم کو ابھی تک وہ حکمتیں معلوم نہیں ورنہ اس کی خلافت اور افضلیت میں شبہ نہ کرتے۔

(قالب: انسانی جسم، ڈھانچہ) (قیافہ: اندازہ، قیاس)

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

آیت میں خلیفہ سے مراد انسان ہے، اور اس کے خلیفہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے اَحکام پر خود بھی عمل کرے اور اپنی طاقت کے مطابق دُوسروں سے بھی کروانے کی کوشش کرے۔

(۲۸) فرشتوں کے اس سوال کا منشاء خدانخواستہ کوئی اعتراض کرنا نہیں تھا بلکہ وہ حیرت کر رہے تھے کہ ایک ایسی مخلوق کو پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے جو نیکی کے ساتھ بدی کی صلاحیت بھی رکھتی ہوگی جس کے نتیجے میں زمین پر فساد پھیلنے کا امکان ہوگا۔ مفسرین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ انسان سے پہلے زمین پر جنات پیدا کئے گئے تھے اور انہوں نے آپس میں لڑ لڑ کر ایک دوسرے کو ختم کر ڈالا تھا۔ فرشتوں نے سوچا کہ شاید انسان کا انجام بھی ایسا ہی ہو۔

اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ ۙ فَقَالَ
اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (۳۱) قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ
لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ (۳۲)

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (تفسیر عثمانی میں) فرماتے ہیں کہ:

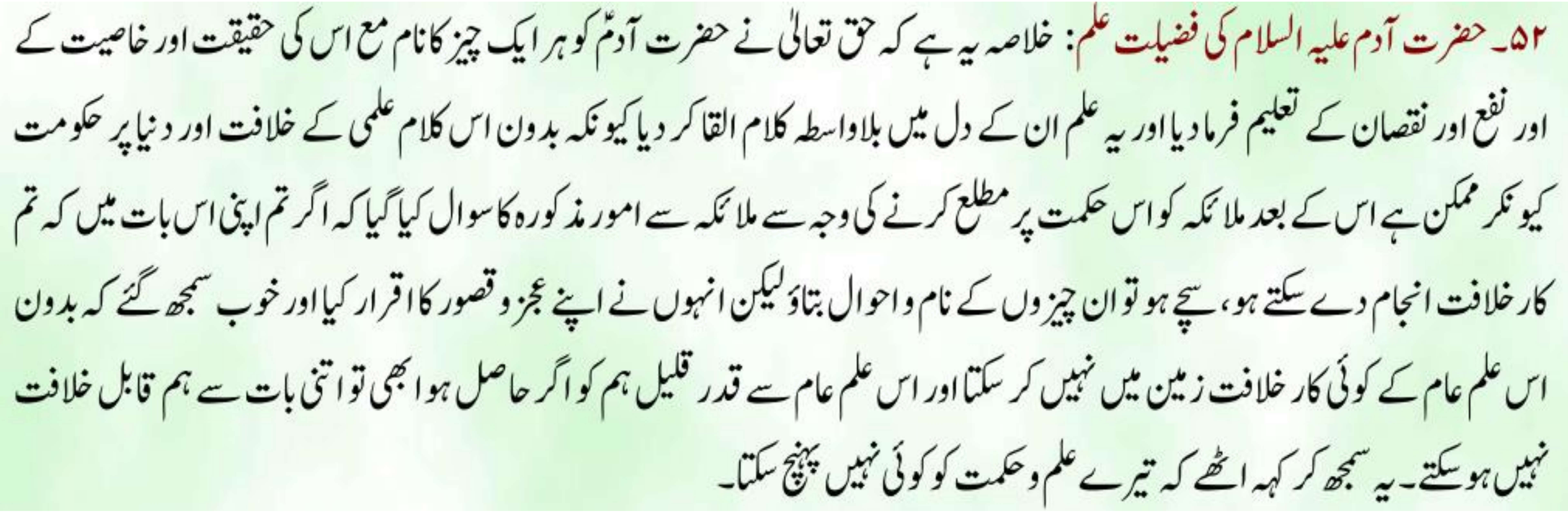

۵۲۔ **حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت علم:** خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ہر ایک چیز کا نام مع اس کی حقیقت اور خاصیت کے اور نفع اور نقصان کے تعلیم فرما دیا اور یہ علم ان کے دل میں بلاواسطہ کلام القا کر دیا کیونکہ بدون اس کلام علمی کے خلافت اور دنیا پر حکومت کیونکر ممکن ہے اس کے بعد ملائکہ کو اس حکمت پر مطلع کرنے کی وجہ سے ملائکہ سے امور مذکورہ کا سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنی اس بات میں کہ تم کار خلافت انجام دے سکتے ہو، سچے ہو تو ان چیزوں کے نام و احوال بتاؤ لیکن انہوں نے اپنے عجز و قصور کا اقرار کیا اور خوب سمجھ گئے کہ بدون اس علم عام کے کوئی کار خلافت زمین میں نہیں کر سکتا اور اس علم عام سے قدر قلیل ہم کو اگر حاصل ہوا بھی تو اتنی بات سے ہم قابل خلافت نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ کر کہہ اٹھے کہ تیرے علم و حکمت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

(۲۹) ناموں سے مراد کائنات میں پائی جانے والی چیزوں کے نام، ان کی خاصیتیں اور انسان کو پیش آنے والی مختلف کیفیات کا علم ہے، مثلاً بھوک، پیاس، صحت اور بیماری وغیرہ۔ اگرچہ آدم علیہ السلام کو ان چیزوں کی تعلیم دیتے وقت فرشتے بھی موجود تھے، لیکن چونکہ ان کی فطرت میں ان چیزوں کی پوری سمجھ نہیں تھی اس لئے جب ان کا امتحان لیا گیا تو وہ جواب نہیں دے سکے، اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے عملی طور پر انہیں باور کرادیا کہ جو کام اس نئ مخلوق سے لینا مقصود ہے وہ فرشتے انجام نہیں دے سکتے۔

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

(۳۰) بظاہر ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام صرف حضرت آدم علیہ السلام کو سکھائے گئے تھے، اور فرشتے اس تعلیم میں شریک نہیں تھے۔ اس صورت میں ان سے ان ناموں کے بارے میں پوچھنا یہ جتانے کے لئے تھا کہ تم میں وہ صلاحیت نہیں رکھی گئی جو آدم علیہ السلام کی تخلیق سے مقصود ہے۔ دوسرا اِحتمال یہ بھی ہے کہ آدم علیہ السلام کو سکھاتے وقت فرشتے موجود تو تھے لیکن چونکہ ان میں ان باتوں کو سمجھنے یا یاد رکھنے کی صلاحیت نہیں تھی اس لئے وہ امتحان کے وقت جواب نہ دے سکے۔ اس صورت میں ان کے جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ ہمیں وہی علم حاصل ہوسکتا ہے جو آپ ہمیں دینا چاہیں اور اس کی صلاحیت ہمارے اندر پیدا کر دیں۔

اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں

قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ‌ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡۙ قَالَ اَلَمۡ
اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ
وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ۝٣٣

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (تفسیر عثمانی میں) فرماتے ہیں کہ:

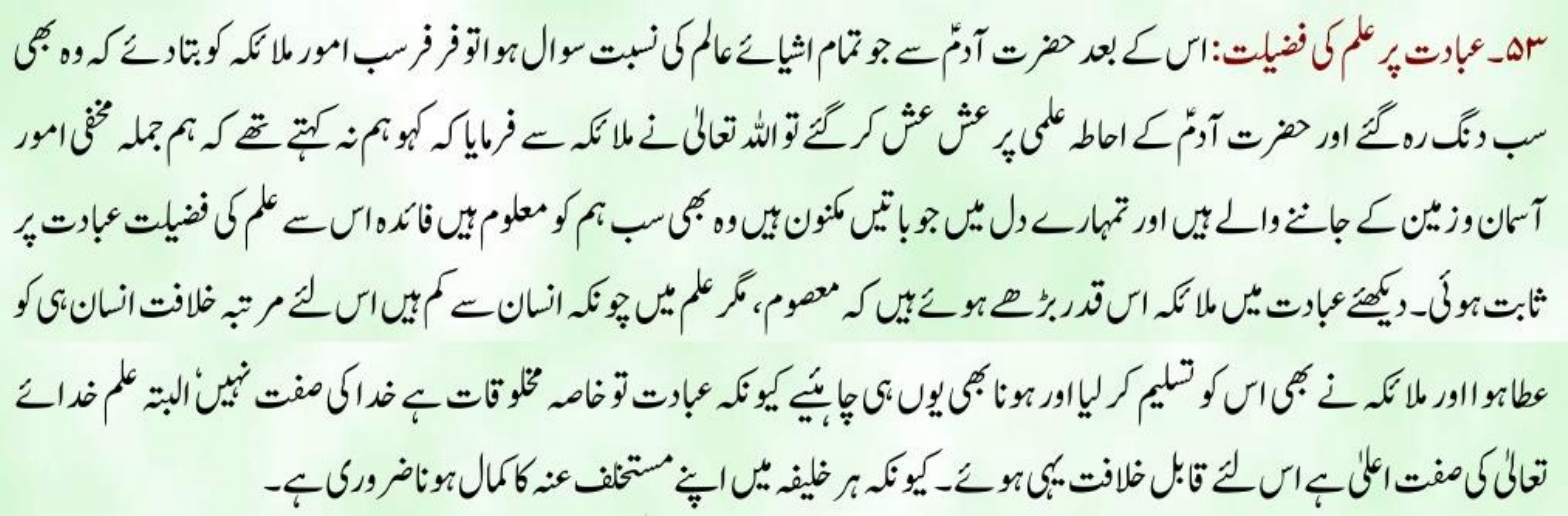

۵۳۔ عبادت پر علم کی فضیلت: اس کے بعد حضرت آدمؑ سے جو تمام اشیائے عالم کی نسبت سوال ہوا تو فر فر سب امور ملائکہ کو بتادئے کہ وہ بھی سب دنگ رہ گئے اور حضرت آدمؑ کے احاطہ علمی پر عش عش کر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا کہ کہو ہم نہ کہتے تھے کہ ہم جملہ مخفی امور آسمان و زمین کے جاننے والے ہیں اور تمہارے دل میں جو باتیں مکنون ہیں وہ بھی سب ہم کو معلوم ہیں فائدہ اس سے علم کی فضیلت عبادت پر ثابت ہوئی۔ دیکھئے عبادت میں ملائکہ اس قدر بڑھے ہوئے ہیں کہ معصوم، مگر علم میں چونکہ انسان سے کم ہیں اس لئے مرتبہ خلافت انسان ہی کو عطا ہوا اور ملائکہ نے بھی اس کو تسلیم کر لیا اور ہونا بھی یوں ہی چاہئیے کیونکہ عبادت تو خاصہ مخلوقات ہے خدا کی صفت نہیں البتہ علم خدائے تعالیٰ کی صفت اعلیٰ ہے اس لئے قابل خلافت یہی ہوئے۔ کیونکہ ہر خلیفہ میں اپنے مستخلف عنہ کا کمال ہونا ضروری ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ (بیان القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

ان الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ فرشتوں کی خواہش یہ تھی کہ خلافت ہمیں ملے، ہم خدامِ ادب ہیں، ہر وقت تسبیح وتحمید اور تقدیس میں مصروف ہیں، جو حکم ملتا ہے بجا لاتے ہیں، تو یہ خلافت کسی اور مخلوق کو کیوں دی جا رہی ہے۔

اب آگے چونکہ تیسری مخلوق کا ذکر بھی آئے گا لہٰذا یہاں نوٹ کر لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی تین مخلوقات ایسی ہیں جو صاحب تشخص اور صاحبِ شعور ہیں اور جن میں ''اَنا'' (میں) کا شعور ہے۔ ایک ملائکہ ہیں، ان کی تخلیق نور سے ہوئی ہے۔ دوسرے انسان ہیں، جن کی تخلیق گارے سے ہوئی ہے اور تیسرے جنات ہیں، جن کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے۔ باقی حیوانات ہیں، اُن میں شعور (consciousness) تو ہے، خود شعوری (self consciousness) نہیں ہے۔ انسان جب دیکھتا ہے تو اس کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں، جبکہ کتا یا بلاّ دیکھتا ہے تو اسے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ میں دیکھ رہا ہوں۔ حیوانات میں ''میں'' کا شعور نہیں ہے۔ یہ اَنا، Self یا Ego صرف فرشتوں میں، انسان میں اور جنات میں ہے۔ ان میں سے ایک نوری مخلوق ہے، ایک ناری مخلوق ہے اور ایک خاکی ہے، جو زمین کے اس قشر (crust) میں مٹی اور پانی کے ملغوبے یعنی گارے سے وجود میں آئی ہے۔

اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ط اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ قز

وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۴﴾

مولانا عبدالحمید سواتیؒ (معالم العرفان میں) فرماتے ہیں کہ:

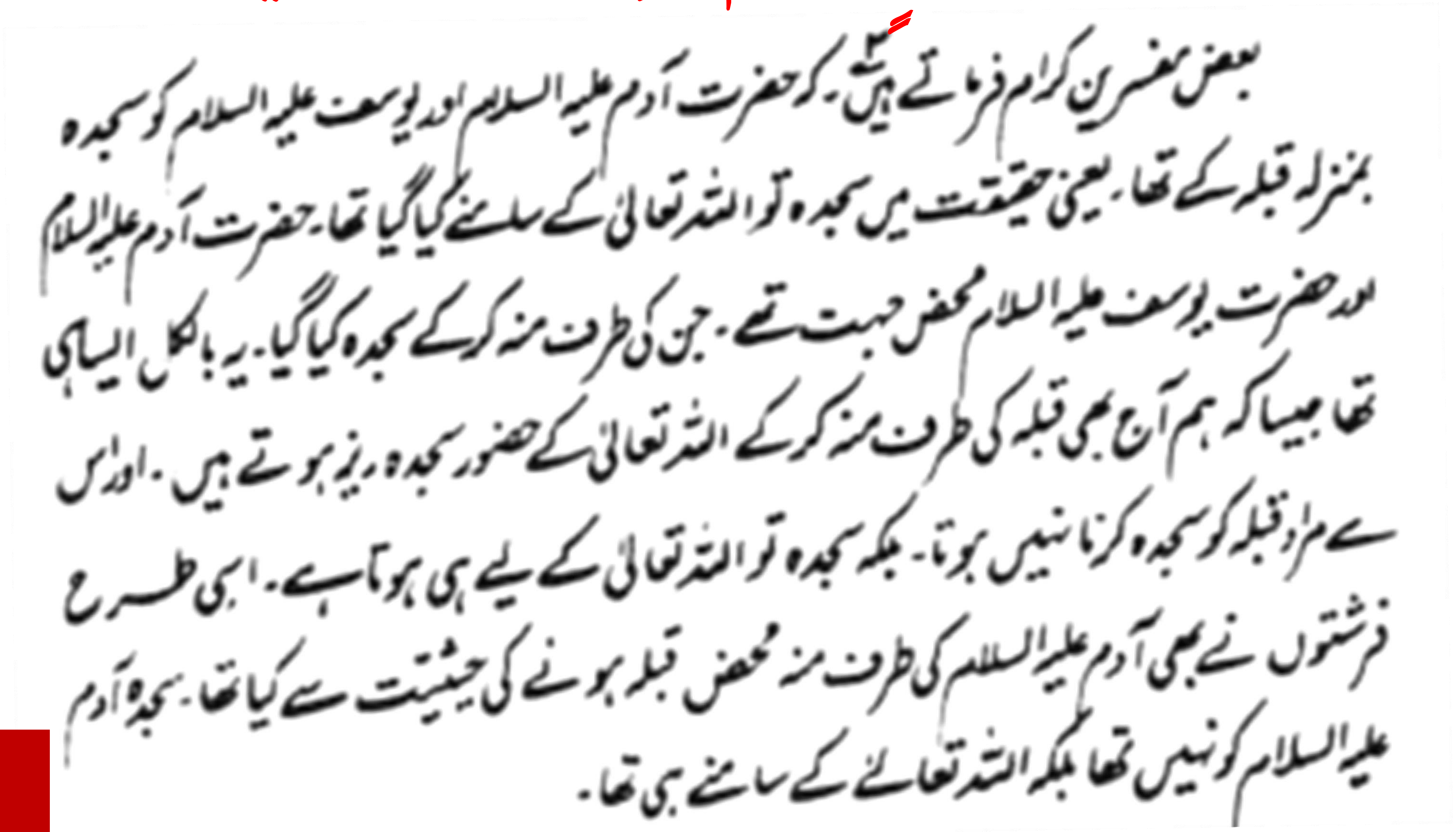

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کو سجدہ بمنزلہ قبلہ کے تھا۔ یعنی حقیقت میں سجدہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا گیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام محض جہت تھے۔ جن کی طرف منہ کر کے سجدہ کیا گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ہم آج بھی قبلہ کی طرف منہ کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اور اس سے مراد قبلہ کو سجدہ کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ سجدہ تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح فرشتوں نے بھی آدم علیہ السلام کی طرف منہ محض قبلہ ہونے کی حیثیت سے کیا تھا۔ سجدہ آدم علیہ السلام کو نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہی تھا۔

جاری ہے

مولانا عبدالحمید سواتیؒ (معالم العرفان میں) فرماتے ہیں کہ:

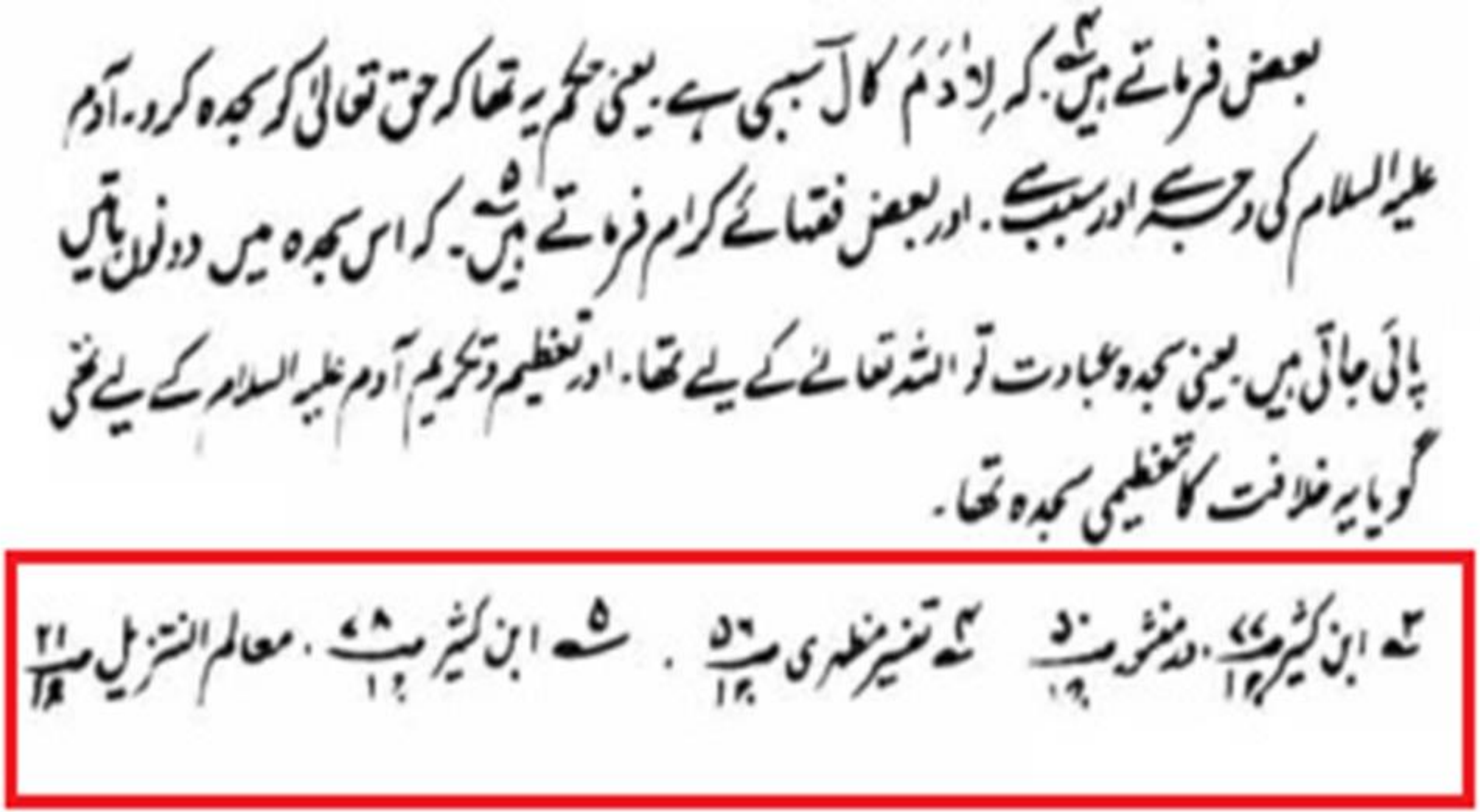

بعض فرماتے ہیں ٹہ کہ لِاٰدَمَ کا لام سببی ہے۔ یعنی حکم یہ تھا کہ حق تعالیٰ کو سجدہ کرو۔ آدم علیہ السلام کی وجہ سے اور سبب سے۔ اور بعض فقہائے کرام فرماتے ہیں شہ کہ اس سجدہ میں دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی سجدہ و عبادت تو اللہ تعالیٰ کے لیے تھا۔ اور تعظیم و تکریم آدم علیہ السلام کے لیے تھی گویا یہ خلافت کا تعظیمی سجدہ تھا۔

ٹہ ابن کثیر ص ۷۷ ج ۱، درمنثور ص ۵۰ ج ۱ ھہ تفسیر مظہری ص ۵۶ ج ۱ ۔ شہ ابن کثیر ص ۷۸ ج ۱، معالم التنزیل ص ۲۱ ج ۱

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (تفسیر عثمانی میں) فرماتے ہیں کہ:

۵۴۔ سجدے کا حکم اور ابلیس کی نافرمانی: جب حضرت آدمؑ کا خلیفہ ہونا مسلم ہو چکا تو فرشتوں کو اور ان کے ساتھ جنات کو حکم ہوا کہ حضرت آدمؑ کی طرف سجدہ کریں اور ان کو قبلہ سجود بنائیں جیسا سلاطین اپنا اول ولی عہد مقرر کرتے ہیں پھر ارکان دولت کو نذریں پیش کرنے کا حکم کرتے ہیں تا کہ کسی کو سرتابی کی گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ سب نے سجدہ مذکورہ ادا کیا سوائے ابلیس کے کہ اصل سے جنات میں تھا اور ملائکہ کے ساتھ کمال اختلاط رکھتا تھا اور سبب اس سرکشی کا یہ ہوا کہ جنات چند ہزار سال سے زمین میں متصرف تھے اور آسمان پر بھی جاتے تھے جب ان کا فساد اور خونریزی بڑھی تو ملائکہ نے بحکم الٰہی بعض کو قتل کیا اور بعض کو جنگل پہاڑ اور جزائر میں منتشر کر دیا۔ ابلیس ان میں بڑا عالم و عابد تھا اس نے جنات کے فساد سے اپنی بے لوثی ظاہر کی، فرشتوں کی سفارش سے یہ بچ گیا اور ان ہی میں رہنے لگا اور اس طمع میں کہ تمام جنات کی جگہ اب صرف میں زمین میں متصرف بنایا جاؤں عبادت میں بہت کوشش کرتا رہا اور خلافت ارض کا خیال پکاتا رہا جب حکم الٰہی حضرت آدمؑ کی نسبت خلافت کا ظاہر ہوا تو ابلیس مایوس ہوا اور عبادت ریائی کے رائگاں جانے پر جوش حسد میں سب کچھ کیا اور ملعون ہوا۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (تفسیر عثمانی میں) فرماتے ہیں کہ:

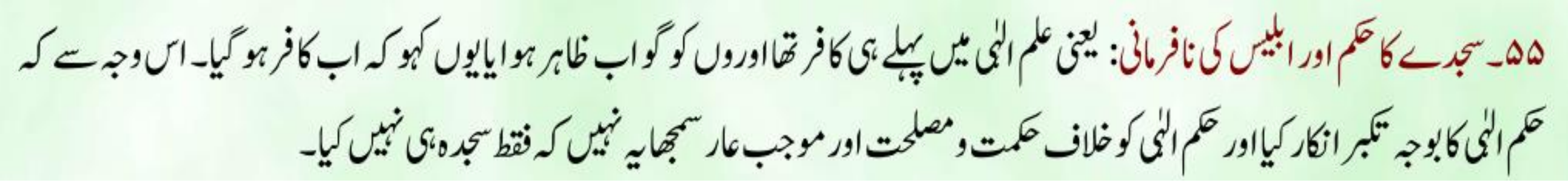

۵۵۔ سجدے کا حکم اور ابلیس کی نافرمانی: یعنی علم الٰہی میں پہلے ہی کافر تھا اوروں کو گو اب ظاہر ہوا یا یوں کہو کہ اب کافر ہو گیا۔ اس وجہ سے کہ حکم الٰہی کا بوجہ تکبر انکار کیا اور حکم الٰہی کو خلاف حکمت و مصلحت اور موجب عار سمجھا یہ نہیں کہ فقط سجدہ ہی نہیں کیا۔

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

(۳۱) فرشتوں کے سامنے آدم علیہ السلام کی عظمت کا عملی مظاہرہ اور ان کا امتحان لینے کے لئے انہیں آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ سجدہ عبادت کا نہیں تعظیم کا سجدہ تھا جو بعض پچھلی شریعتوں میں جائز تھا، بعد میں تعظیم کے لئے بھی اللہ تعالی کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کی سختی سے ممانعت کردی گئی تاکہ شرک کا کوئی شائبہ بھی پیدا نہ ہو۔ یہ سجدہ کروانا اس بات کا بھی مظاہرہ تھا کہ فرشتوں کو اس بات کی تلقین کی جارہی ہے کہ کائنات میں جو چیزیں ان کے اختیار میں دی گئی ہیں وہ انسان کے لئے مسخر کردی جائیں، تاکہ یہ دیکھا جائے کہ وہ ان کو صحیح استعمال کرتا ہے یا غلط۔

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

(۳۲) اگرچہ براہِ راست سجدے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا تھا، مگر اس میں تمام جاندار مخلوقات بھی شامل تھیں، لہٰذا اِبلیس جو جنات میں سے تھا اس پر بھی اس حکم کی تعمیل لازم تھی۔ لیکن جیسا کہ خود قرآنِ کریم نے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے کہنے لگا کہ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے، اس لئے میں اس سے افضل ہوں، میں اسے کیوں سجدہ کروں؟ (قرآن کریم، سورہ اعراف ۷: ۱۲)۔ اس واقعے سے دو سبق ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے آپ کو بذاتِ خود دوسروں سے بڑا سمجھنا اور اپنی بڑائی بگھارنا کتنا بڑا گناہ ہے۔ اور دوسرا سبق یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی واضح حکم آجائے تو بندے کا کام یہ ہے کہ اس حکم کو دِل و جان سے بجا لائے، چاہے اس کی حکمت اور فائدہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

ابن کثیرؒ (تفسیر ابن کثیر میں) فرماتے ہیں کہ:

ابن عباسؓ کہتے ہیں، نافرمانی سے پہلے وہ فرشتوں میں تھا۔ عزرائیل اس کا نام تھا، زمین پر اس کی رہائش تھی، اجتہاد اور علم میں بہت بڑا تھا اور اسی وجہ سے دماغ میں رعونت تھی اور اس کی جماعت کا اور اس کا تعلق جنوں سے تھا۔ اس کے چار پر تھے۔ جنت کا خازن تھا، زمین اور آسمان دنیا کا سلطان تھا۔ حضرت حسنؒ فرماتے ہیں۔ ابلیس کبھی فرشتہ نہ تھا۔ اس کی اصل جنات سے ہے جیسے کہ آدم کی اصل انس سے ہے۔ اس کی اسناد صحیح ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلمؒ اور شہر بن حوشبؒ کا بھی یہی قول ہے۔ سعد بن مسعودؒ کہتے ہیں کہ فرشتوں نے جنات کو جب مارا تب اسے قید کیا تھا اور آسمان پر لے گئے تھے۔ وہاں کی عبادت کی وجہ سے رہ پڑا۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ (تیسیر القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

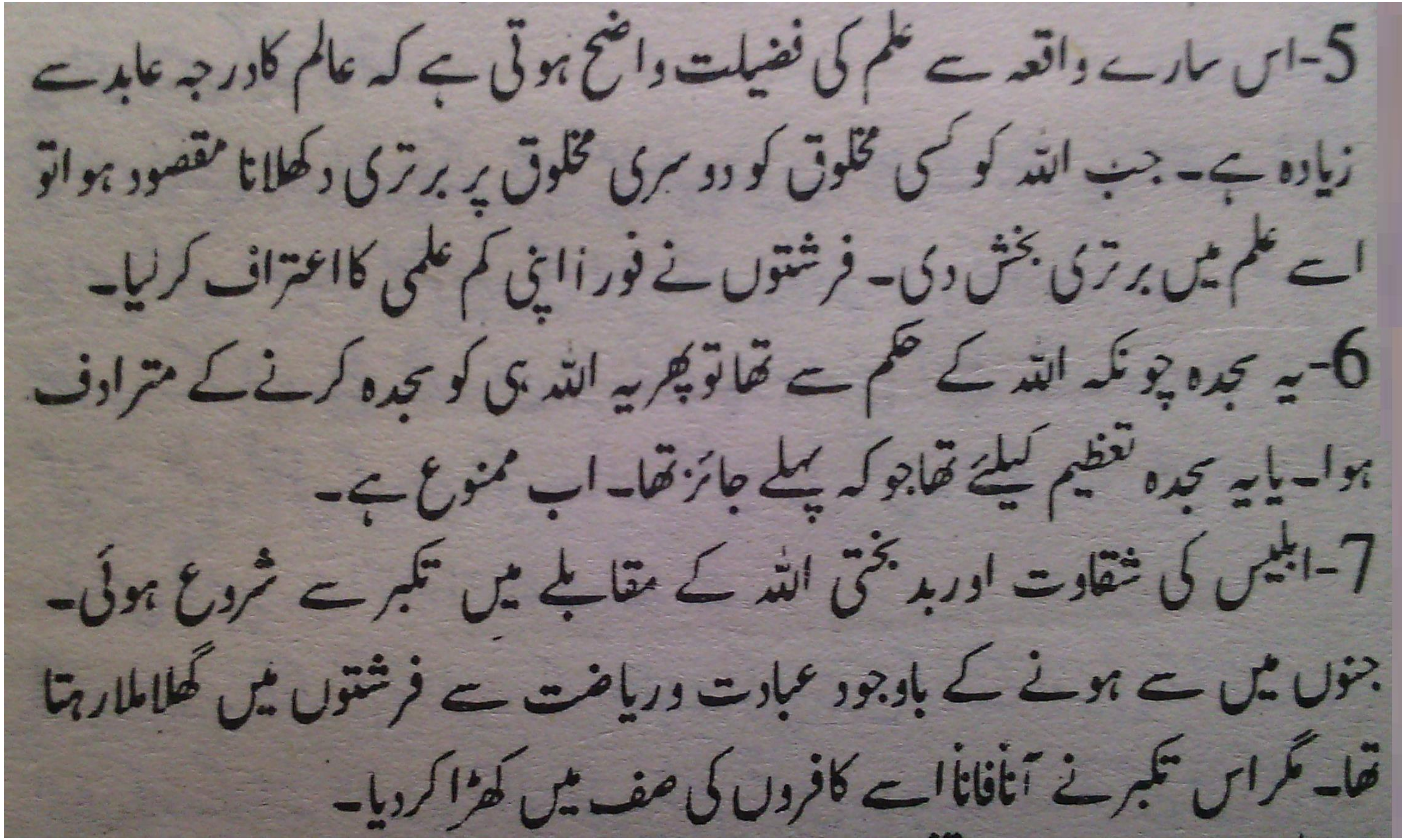

5- اس سارے واقعہ سے علم کی فضیلت واضح ہوتی ہے کہ عالم کا درجہ عابد سے زیادہ ہے۔ جب اللہ کو کسی مخلوق کو دوسری مخلوق پر برتری دکھلانا مقصود ہوا تو اسے علم میں برتری بخش دی۔ فرشتوں نے فوراً اپنی کم علمی کا اعتراف کرلیا۔

6- یہ سجدہ چونکہ اللہ کے حکم سے تھا تو پھر یہ اللہ ہی کو سجدہ کرنے کے مترادف ہوا۔ یا یہ سجدہ تعظیم کیلئے تھا جو کہ پہلے جائز تھا۔ اب ممنوع ہے۔

7- ابلیس کی شقاوت اور بدبختی اللہ کے مقابلے میں تکبر سے شروع ہوئی۔ جنوں میں سے ہونے کے باوجود عبادت و ریاضت سے فرشتوں میں گھلا ملا رہتا تھا۔ مگر اس تکبر نے آناً فاناً اسے کافروں کی صف میں کھڑا کردیا۔

اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں

وَ قُلْنَا يٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ

شِئْتُمَا ۖ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (تفسیر عثمانی میں) فرماتے ہیں کہ:

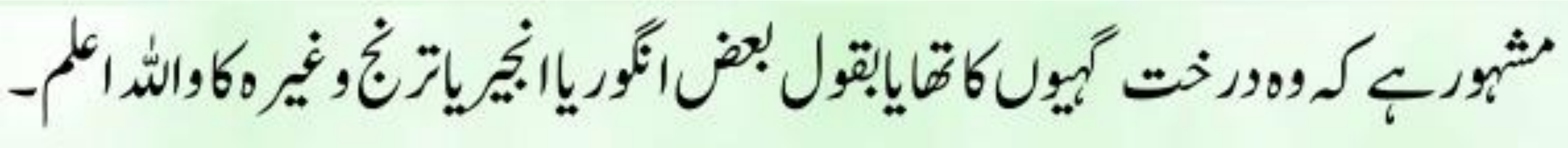

مشہور ہے کہ وہ درخت گیہوں کا تھا یا بقول بعض انگور یا انجیر یا ترنج وغیرہ کا واللہ اعلم۔

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

(۳۳) یہ کونسا درخت تھا؟ قرآنِ کریم نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی، نہ اس کے جاننے کی ضرورت ہے۔ اتنا جان لینا کافی ہے کہ جنت کے درختوں میں ایک درخت ایسا تھا جس کا پھل کھانے سے انہیں روک دیا گیا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ گندم کا درخت تھا، بعض میں انگور کا ذکر ہے، مگر کوئی روایت ایسی نہیں جس پر پورا بھروسہ کیا جاسکے۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ (بیان القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

اب اس کی بھی حکمت سمجھئے کہ یہ اس demonstration کا حصہ ہے کہ دنیا میں کھانے پینے کی ہزاروں چیزیں مباح ہیں، صرف چند چیزیں حرام ہیں۔ اب اگر تم ہزاروں مباح چیزوں کو چھوڑ کر حرام میں منہ مارتے ہو تو یہ نافرمانی شمار ہوگی۔ اللہ نے مباحات کا دائرہ بہت وسیع رکھا ہے۔ چند رشتے ہیں جو بیان کر دیے گئے کہ یہ حرام ہیں، محرماتِ ابدیہ ہیں، ان سے تو شادی نہیں ہو سکتی، باقی ایک مسلمان مرد کسی مسلمان عورت سے دنیا کے کسی بھی کونے میں شادی کر سکتا ہے، اس کے لیے کروڑوں options کھلے ہیں۔ پھر ایک نہیں، دو دو، تین تین، چار چار تک عورتوں سے شادی کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے باوجود انسان شادی نہ کرے اور زنا کرے، تو یہ گویا اس کی اپنی خباثتِ نفس ہے۔ چنانچہ آدم وحوا (علیہما السلام) کو بتا دیا گیا کہ یہ پورا باغ تمہارے لیے مباح ہے، بس یہ ایک درخت ہے، اس کے پاس نہ جانا۔ درخت کا نام لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ تو صرف ایک آزمائش اور اس کی demonstration تھی۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ (تیسیر القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

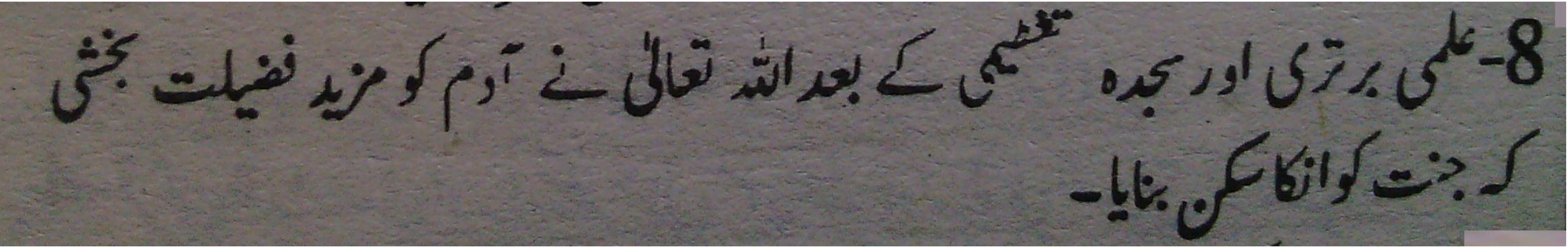

8- علمی برتری اور سجدہ تعظیمی کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم کو مزید فضیلت بخشی کہ جنت کو انکا مسکن بنایا۔

اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ
لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۳۶

مولانا ادریس کاندھلویؒ (معارف القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

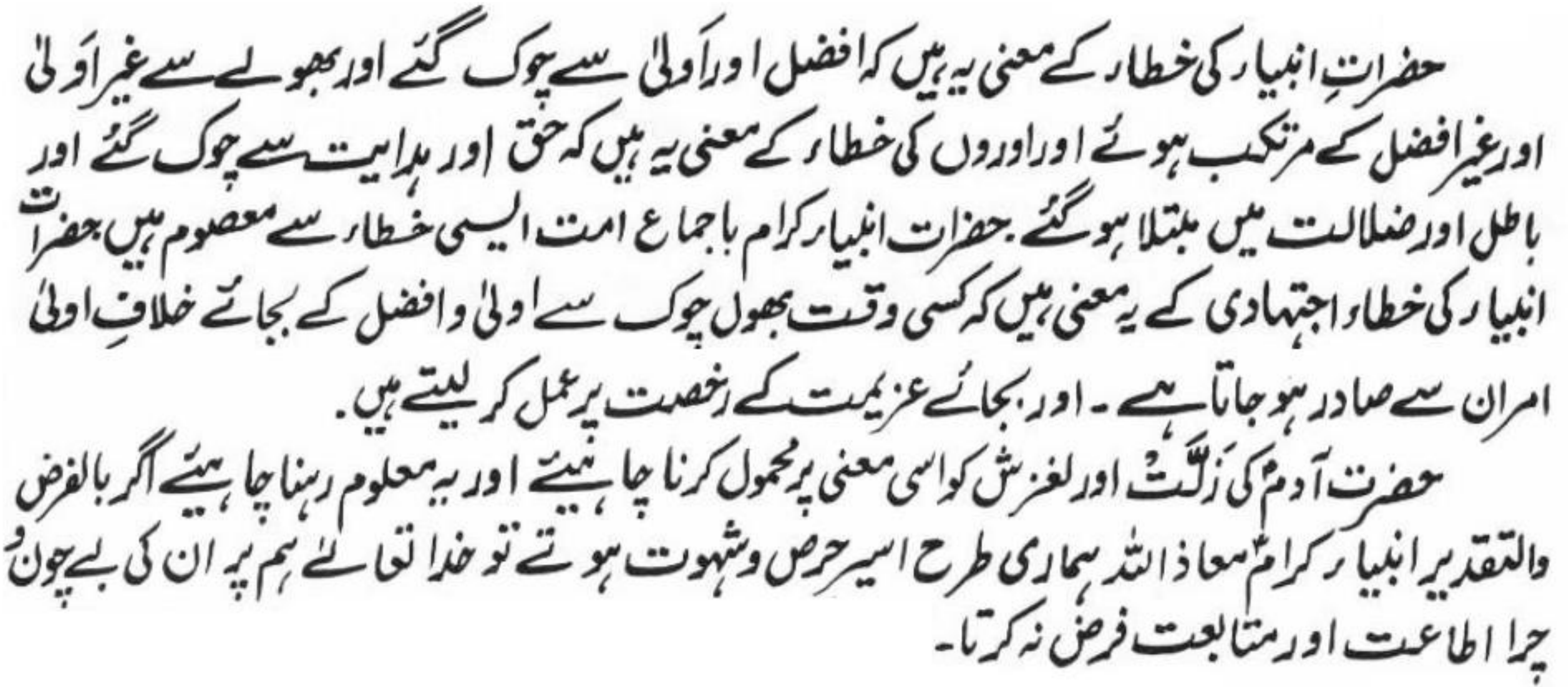

حضراتِ انبیاء کی خطاء کے معنی یہ ہیں کہ افضل اور اَولیٰ سے چوک گئے اور بھولے سے غیر اَولیٰ اور غیر افضل کے مرتکب ہوئے اور اوروں کی خطاء کے معنی یہ ہیں کہ حق اور ہدایت سے چوک گئے اور باطل اور ضلالت میں مبتلا ہو گئے۔ حضرات انبیاء کرام باجماع امت ایسی خطاء سے معصوم ہیں حضرات انبیاء کی خطاء اجتہادی کے یہ معنی ہیں کہ کسی وقت بھول چوک سے اولیٰ و افضل کے بجائے خلافِ اولیٰ امر ان سے صادر ہو جاتا ہے۔ اور بجائے عزیمت کے رخصت پر عمل کر لیتے ہیں۔

حضرت آدمؑ کی زَلّت اور لغزش کو اسی معنی پر محمول کرنا چاہیے اور یہ معلوم رہنا چاہیے اگر بالفرض والتقدیر انبیاء کرامؑ معاذ اللہ ہماری طرح اسیر حرص و شہوت ہوتے تو خدا تعالیٰ ہم پر ان کی بے چون و چرا اطاعت اور متابعت فرض نہ کرتا۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (تفسیر عثمانی میں) فرماتے ہیں کہ:

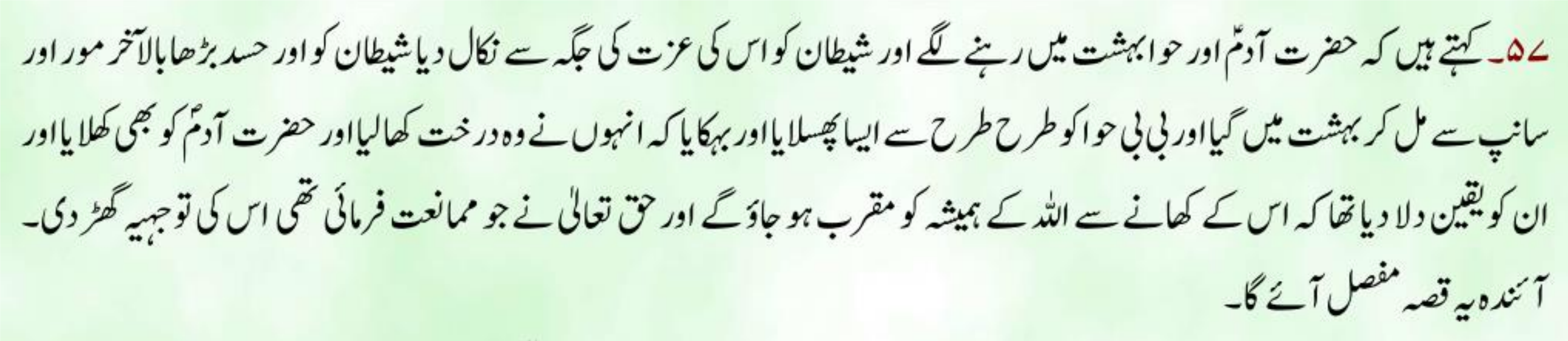

٥٧۔ کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ اور حوا بہشت میں رہنے لگے اور شیطان کو اس کی عزت کی جگہ سے نکال دیا شیطان کو اور حسد بڑھا بالآخر مور اور سانپ سے مل کر بہشت میں گیا اور بی بی حوا کو طرح طرح سے ایسا پھسلایا اور بہکایا کہ انہوں نے وہ درخت کھالیا اور حضرت آدمؑ کو بھی کھلایا اور ان کو یقین دلا دیا تھا کہ اس کے کھانے سے اللہ کے ہمیشہ کو مقرب ہو جاؤ گے اور حق تعالیٰ نے جو ممانعت فرمائی تھی اس کی توجیہہ گھڑ دی۔ آئندہ یہ قصہ مفصل آئے گا۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (تفسیر عثمانی میں) فرماتے ہیں کہ:

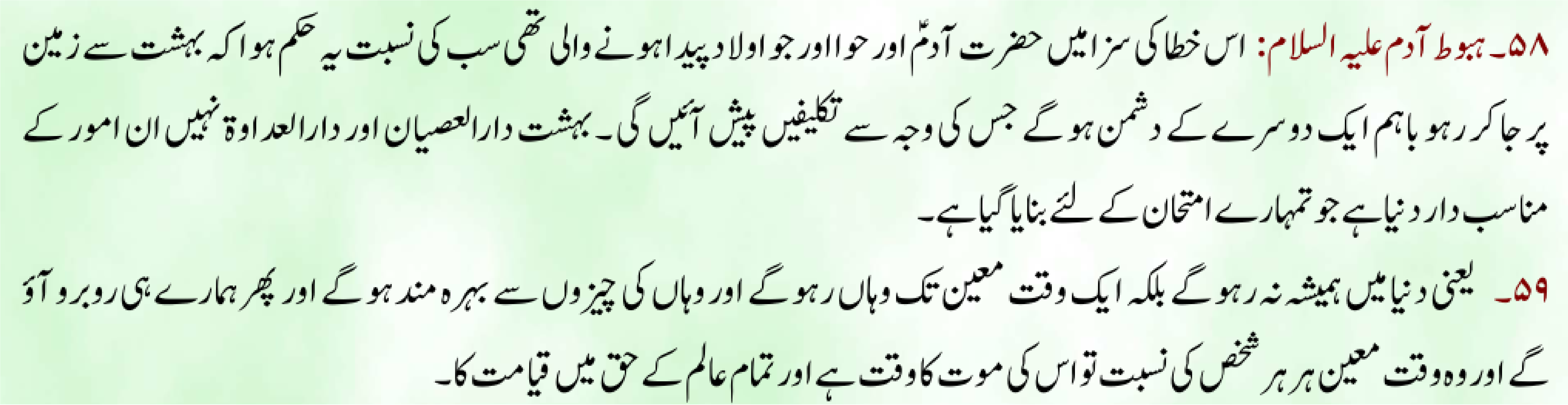

۵۸۔ **ہبوط آدم علیہ السلام:** اس خطا کی سزا میں حضرت آدمؑ اور حوا اور جو اولاد پیدا ہونے والی تھی سب کی نسبت یہ حکم ہوا کہ بہشت سے زمین پر جا کر رہو باہم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے جس کی وجہ سے تکلیفیں پیش آئیں گی۔ بہشت دارالعصیان اور دارالعداوۃ نہیں ان امور کے مناسب دار دنیا ہے جو تمہارے امتحان کے لئے بنایا گیا ہے۔

۵۹۔ یعنی دنیا میں ہمیشہ نہ رہو گے بلکہ ایک وقت معین تک وہاں رہو گے اور وہاں کی چیزوں سے بہرہ مند ہو گے اور پھر ہمارے ہی روبرو آؤ گے اور وہ وقت معین ہر ہر شخص کی نسبت تو اس کی موت کا وقت ہے اور تمام عالم کے حق میں قیامت کا۔

مولانا ادریس کاندھلویؒ (معارف القرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

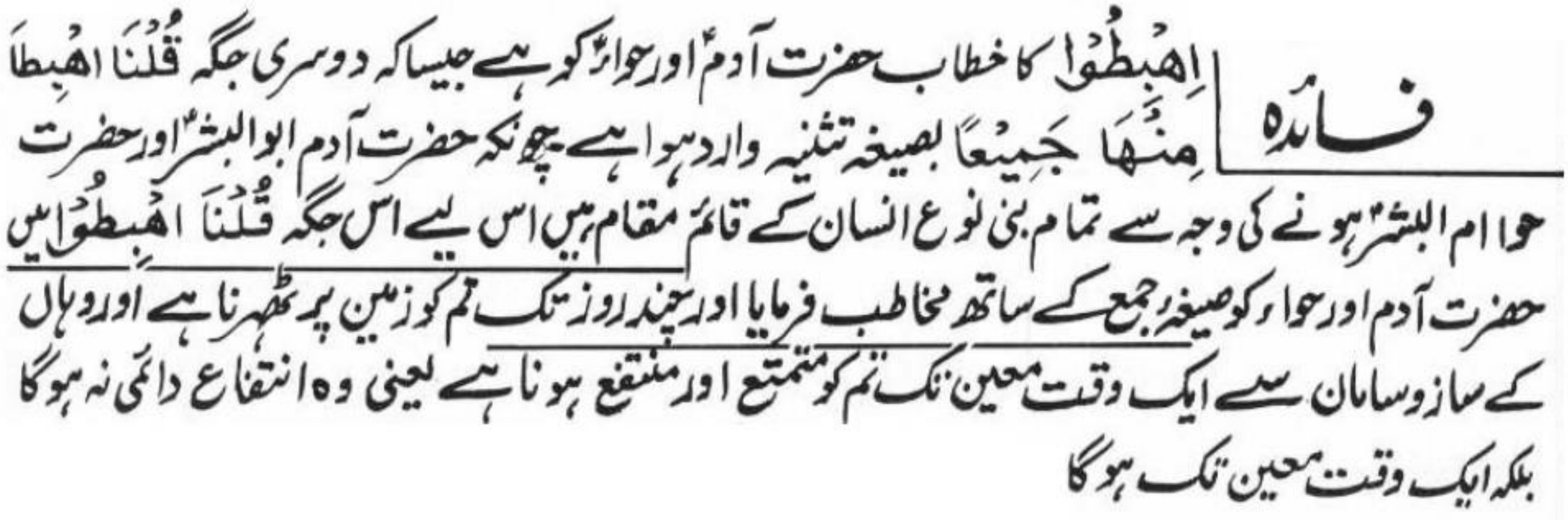

فائدہ

اِهْبِطُوْا کا خطاب حضرت آدمؑ اور حواؑ کو ہے جیسا کہ دوسری جگہ قُلْنَا اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بصیغہ تثنیہ وارد ہوا ہے چونکہ حضرت آدم ابو البشرؑ اور حضرت حوا ام البشرؑ ہونے کی وجہ سے تمام بنی نوع انسان کے قائم مقام ہیں اس لیے اس جگہ قُلْنَا اهْبِطُوْا میں حضرت آدم اور حواؑ کو صیغہ جمع کے ساتھ مخاطب فرمایا اور چند روز تک تم کو زمین پر ٹھہرنا ہے اور وہاں کے ساز و سامان سے ایک وقت معین تک تم کو متمتع اور منتفع ہونا ہے یعنی وہ انتفاع دائمی نہ ہوگا بلکہ ایک وقت معین تک ہوگا

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

(۳۴) یعنی شیطان نے انہیں بہکا کر اس درخت کا پھل کھانے پر آمادہ کر دیا۔ اور بہانہ یہ بنایا کہ یوں تو یہ درخت بڑا مفید ہے، کیونکہ اس کو کھانے سے ابدی زندگی حاصل ہو جاتی ہے، لیکن شروع میں آپ کو اس لئے منع کیا گیا تھا کہ آپ کی جسمانی کیفیت اس کو برداشت نہ کر سکتی تھی، اب چونکہ آپ جنت کے ماحول کے عادی ہو گئے ہیں، اور آپ کے قویٰ مضبوط ہو چکے ہیں، اس لئے اب وہ ممانعت باقی نہیں رہی۔ اس واقعے کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: سورۂ اَعراف (۷:۱۹ تا ۲۳) اور سورۂ طٰہٰ (۲۰:۱۲۰)۔

مفتی تقی عثمانی مدظلہ (آسان ترجمہ قرآن میں) فرماتے ہیں کہ:

(۳۵) مطلب یہ ہے کہ اس واقعے کے نتیجے میں آدم علیہ السلام اور ان کی اہلیہ کو جنت سے اور شیطان کو آسمانوں سے نیچے زمین پر اُترنے کا حکم دے دیا گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتادیا گیا کہ انسان اور شیطان کے درمیان رہتی دُنیا تک دُشمنی قائم رہے گی، اور زمین کا یہ قیام ایک معین مدّت تک ہوگا جس میں کچھ دُنیوی فائدے اُٹھانے کے بعد سب کو بالآخر اللہ تعالیٰ کے پاس دوبارہ پیش ہونا ہوگا۔

جزاكم الله واحسن الجزا